ماہنامہ

اشراق

لاہور

جنوری ۲۰۲۳ء

زیرسرپرستی

جاوید احمد غامدی

”نکاح اصلاً مسلمان عورتوں ہی سے جائز ہے۔ اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ اِس کی اجازت ایک استثنا ہے جس سے اُسی صورت میں فائدہ اٹھانا چاہیے، جب ماحول میں اسلام اور اسلامی تہذیب کا غلبہ ہو۔“

—— قرآنیات

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ و تلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن و سنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول و فروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق و تنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشر و اشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن و سنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان و اخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم و تعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشو و نما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما و صالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگیِ قلب و نظر کا اہتمام کریں۔

---

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

ماہنامہ
اشراق
لاہور

جلد ۳۵ شمارہ ۱ جنوری ۲۰۲۳ء جمادی الثانی ۱۴۴۴ھ

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر
سید منظور الحسن

فی شمارہ 50 روپے
سالانہ 500 روپے
رجسٹرڈ 1000 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر)

بیرون ملک
سالانہ 50 ڈالر

فہرست

شذرات

رسولوں پر نبیوں سے اضافی ذمہ داریاں — سید منظور الحسن — ۴

قرآنیات

البیان: الاحزاب ۳۳: ۴۹-۵۲ (۵) — جاوید احمد غامدی — ۹

مقالات

''میزان'': توضیحی مطالعہ: قانون سیاست (۴) — محمد عمار خان ناصر — ۱۶

نقطۂ نظر

اللہ تعالیٰ کے لیے 'خدا' کے اسم کا استعمال — ابو یحییٰ — ۲۶

سیر و سوانح

مہاجرین حبشہ (۱۵) — محمد وسیم اختر مفتی — ۳۲

اصلاح و دعوت

دین داری یا مسلک پرستی — محمد ذکوان ندوی — ۳۹

بچوں کے ادب میں تشدد پسندی اور سفاکیت — ڈاکٹر عرفان شہزاد — ۴۱

مکالمہ

محمد حسن الیاس سے ایک انٹرویو — علیزے نجف — ۴۳

وفیات

چار اموات — خورشید احمد ندیم — ۶۰

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
www.ghamidi.net, www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
http://www.javedahmadghamidi.com/index.php/ishraq

سید منظور الحسن

رسولوں پر نبیوں سے اضافی ذمہ داریاں

اللہ کے نبی جس کام پر مامور ہوتے ہیں، قرآن کی اصطلاح میں وہ انذار و بشارت ہے۔ یعنی وہ آسمان سے وحی پاکر لوگوں کو حق بتاتے ہیں اور ایمان لانے والوں کو قیامت کے اچھے انجام کی خوش خبری سناتے ہیں اور انکار کرنے والوں کو برے انجام سے خبردار کرتے ہیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً قف فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ. (البقرہ ۲: ۲۱۳)

”لوگ ایک ہی امت تھے۔ پھر (اُن میں اختلاف پیدا ہوا تو) اللہ نے نبی بھیجے، بشارت دیتے اور انذار کرتے ہوئے۔“

حضرت آدم، حضرت ادریس، حضرت اسمٰعیل، حضرت اسحٰق، حضرت یعقوب، حضرت یوسف، حضرت الیاس، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہم السلام کا شمار اِنھی انبیا میں ہوتا ہے۔

نبیوں میں سے بعض ہستیوں کو اللہ تعالیٰ رسالت کے منصب پر فائز کرتے ہیں۔ اِن کا کام انذار و بشارت تک محدود نہیں ہوتا، اُس سے آگے بڑھ کر وہ عملاً حق کا غلبہ قائم کرتے ہیں۔ گویا وہ خدا کی عدالت بن کر آتے ہیں اور مخاطبین کے بارے میں جزا و سزا کا فیصلہ اِسی دنیا میں اُن پر نافذ کر کے رخصت ہوتے ہیں۔ سورۂ یونس میں فرمایا ہے:

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ج فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ. (۱۰: ۴۷)

”(اُس کا قانون یہی ہے کہ) ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔ پھر جب اُن کا رسول آجاتا ہے تو اُن کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہے اور اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا۔‘‘

سورۂ مجادلہ میں ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اُولٰٓئِكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ. كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ.(۵۸: ۲۰-۲۱)

’’(تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) جو اللہ اور اُس کے رسول سے دشمنی کریں گے، وہی سب سے بڑھ کر ذلیل ہونے والوں میں ہوں گے۔ اِس لیے کہ اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول غالب ہو کر رہیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ بڑے زور والا اور بڑا زبردست ہے۔‘‘

حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت ابراہیم، حضرت لوط، حضرت یونس، حضرت شعیب، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام رسولوں کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں۔ نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی رسالت کے منصب پر فائز تھے۔ چنانچہ اللہ نے آپ کے فرضِ منصبی کو ان الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ.(الصف ۶۱: ۹)

’’وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ (اِس سرزمین کے) تمام ادیان پر اُس کو غالب کر دے، خواہ یہ مشرکین بھی اِسے کتنا ہی ناپسند کریں۔‘‘

رسالت کے باب میں اللہ کی اِس سنت کا نفاذ کیسے ہوتا ہے، اِسے استاذِ گرامی نے اپنی کتاب ’’میزان‘‘ میں بالتفصیل بیان کیا ہے۔

’’اِس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اِن رسولوں کو اپنی دینونت کے ظہور کے لیے منتخب فرماتا اور پھر قیامت سے پہلے ایک قیامت صغریٰ اُن کے ذریعے سے اِسی دنیا میں برپا کر دیتا ہے۔ اُنھیں بتا دیا جاتا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ اپنے میثاق پر قائم رہیں گے تو اِس کی جزا اور اِس سے انحراف کریں گے تو اِس کی سزا اُنھیں دنیا ہی میں مل جائے گی۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُن کا وجود لوگوں کے لیے ایک آیت الٰہی بن جاتا ہے اور وہ خدا کو گویا اُن کے ساتھ زمین پر چلتے پھرتے اور عدالت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اِس کے ساتھ اُنھیں حکم دیا جاتا ہے کہ حق کی جو نشانیاں خود اُنھوں نے بہ چشم سر دیکھ لی ہیں، اُن کی بنیاد پر اُس کی تبلیغ کریں اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت

بے کم و کاست اور پوری قطعیت کے ساتھ لوگوں تک پہنچا دیں۔ قرآن کی تعبیر کے مطابق یہ ''شہادت'' ہے۔ یہ جب قائم ہو جاتی ہے تو دنیا اور آخرت، دونوں میں فیصلۂ الٰہی کی بنیاد بن جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اِن رسولوں کو غلبہ عطا فرماتا اور اِن کی دعوت کے منکرین پر اپنا عذاب نازل کر دیتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید میں 'شَاهِد' اور 'شَهِيْد' اِسی بنا پر کہا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۵ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا.

(المزمل ۷۳: ۱۵)

''تمھاری طرف، (اے قریش مکہ)، ہم نے اُسی طرح ایک رسول تم پر گواہ بنا کر بھیجا ہے، جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا۔'' (۷۳-۷۲)

اللہ کے رسولوں پر شہادت کی یہ ذمہ داری دعوت کے چند خاص مراحل کا تقاضا کرتی ہے۔ اِن مراحل کے کچھ لازمی نتائج بھی ہیں، جو اللہ کی طرف سے ہر حال میں برآمد ہوتے ہیں۔ یہ کل پانچ مراحل ہیں۔ اِن کا اجمالی بیان درج ذیل ہے:

پہلا مرحلہ ''انذار'' ہے۔ اِس کے معنی لوگوں کو اُن کے انجام سے خبردار کرنے کے ہیں۔ اللہ کے نبی تو صرف قیامت کے عذاب سے خبردار کرتے ہیں، مگر اللہ کے رسول اُس عذاب سے بھی متنبہ کرتے ہیں، جو اُن کی دعوت کے مقابلے میں سرکشی اختیار کرنے والوں پر اِسی دنیا میں نازل ہوتا ہے۔ استاذِ گرامی کے الفاظ میں:

''وہ اپنی قوم کو بتاتے ہیں کہ وہ زمین پر ایک قیامت صغریٰ برپا کر دینے کے لیے مبعوث ہوئے ہیں۔ خدا کی حجت جب اُن کی دعوت سے پوری ہو جائے گی تو اُن کی قوم کو اپنی سرکشی کا نتیجہ لازماً اِسی دنیا میں دیکھنا ہوگا۔'' (میزان ۵۳۶)

دوسرا مرحلہ ''انذار عام'' ہے۔ یہ پہلے مرحلے ہی کا تسلسل ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ اِس میں اللہ کے رسول کو حکم دیا جاتا ہے کہ اب وہ اپنی دعوت کو نجی کی مجالس سے آگے بڑھا کر علانیہ اور کھلم کھلا پوری قوم کے سامنے پیش کرے۔

تیسرا مرحلہ ''اتمام حجت'' ہے۔ یعنی رسول کی مسلسل دعوت اور آیاتِ الٰہی کے ظہور کے نتیجے میں پیش کردہ حقائق روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتے ہیں۔ مخاطبین کے پاس اِن کے انکار کے لیے کوئی عذر، کوئی جواب، کوئی سند، کوئی دلیل باقی نہیں رہتی۔ یہی موقع ہے جسے اصطلاح میں ''اتمام حجت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے:

”جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے، وہ اِس طرح مبرہن ہو جائے کہ ضد، ہٹ دھرمی اور عناد کے سوا کوئی چیز بھی آدمی کو اُس کے انکار پر آمادہ نہ کر سکے۔ اِس میں ظاہر ہے کہ خدا کی دینونت کے ساتھ اسلوب، استدلال، کلام اور پیغمبر کی ذات و صفات اور علم و عمل، ہر چیز موثر ہوتی ہے، یہاں تک کہ معاملہ کھلے آسمان پر چمکتے ہوئے سورج کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اِس موقع پر پیغمبر اپنے مخاطبین کا انجام بھی بڑی حد تک واضح کر دیتا ہے اور دعوت میں بھی بالکل آخری تنبیہ کا لب و لہجہ اختیار کر لیتا ہے۔“(میزان ۵۴۰)

چوتھا مرحلہ ”ہجرت و براءت“ ہے۔ جب رسول کے مخاطبین پر حجت تمام ہو جاتی ہے تو یہ مرحلہ آجاتا ہے۔ اِس میں پیغمبر اپنی قوم کو اُس کے انکار کی فرد قرارداد جرم سنا دیتا ہے اور اُس سے بری الذمہ ہونے کا اعلان کر دیتا ہے۔ اِس کے بعد حسبِ حالات اللہ کی طرف سے بتا دیا جاتا ہے کہ قوم کی مہلت ختم ہو گئی اور اُس کی جزا و سزا کا وقت آگیا ہے۔ قوم اگر انکار ہی پر جازم ہو تو پیغمبر کو ہجرت کا حکم دیا جاتا ہے۔

پانچواں اور آخری مرحلہ ”جزا و سزا“ ہے۔ اِس میں مومنین کے لیے جزا اور منکرین کے لیے سزا کا نفاذ ہوتا ہے۔ یہ جزا و سزا من جانب اللہ ہوتی ہے اور اُسی کے حکم کے مطابق اور اُسی کے مقررہ وقت پر دی جاتی ہے۔ اِس کی نوعیت اور اِس کی مختلف صورتوں کے بارے میں استاذ گرامی نے لکھا ہے:

”اِس میں آسمان کی عدالت زمین پر قائم ہوتی ہے، خدا کی دینونت کا ظہور ہوتا ہے اور پیغمبر کی قوم کے لیے ایک قیامت صغریٰ برپا ہو جاتی ہے۔ پیغمبروں کے انذار کی جو تاریخ قرآن میں بیان ہوئی ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس موقع پر بالعموم دو ہی صورتیں پیش آتی ہیں: ایک یہ کہ پیغمبر کے ساتھی بھی تعداد میں بہت کم ہوتے ہیں اور اُسے کوئی دار الہجرت بھی میسر نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ وہ معتدبہ تعداد میں اپنے ساتھیوں کو لے کر نکلتا ہے اور اُس کے نکلنے سے پہلے ہی کسی سرزمین میں اللہ تعالیٰ اُس کے لیے آزادی اور تمکن کے ساتھ رہنے بسنے کا سامان کر دیتا ہے۔ اِن دونوں ہی صورتوں میں رسولوں سے متعلق خدا کی وہ سنت لازماً روبہ عمل ہو جاتی ہے جو قرآن میں اِس طرح بیان ہوئی ہے:

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ.

(یونس ۱۰: ۴۷)

”ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔ پھر جب اُن کا رسول آجاتا ہے تو اُن کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا۔“

پہلی صورت میں رسول کے قوم کو چھوڑ دینے کے بعد، عام اِس سے کہ وہ اُس کی وفات کی صورت میں ہو

یا ہجرت کی صورت میں، یہ فیصلہ اِس طرح صادر ہوتا ہے کہ آسمان کی فوجیں نازل ہوتیں، ساف و حاصب کا طوفان اٹھتا اور ابر و باد کے لشکر قوم پر اِس طرح حملہ آور ہو جاتے ہیں کہ رسول کے مخالفین میں سے کوئی بھی زمین پر باقی نہیں رہتا۔ تاہم یہ معاملہ اُنھی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جن کے لیے قرآن اپنی اصطلاح میں ’مُشْرِکِیْن‘ کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ رہے وہ لوگ جو اصلاً توحید ہی سے وابستہ ہوتے ہیں، اُن کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہوتا۔ اُن کے بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ اُن کے استیصال کے بجاے اُن پر ذلت اور محکومی کا عذاب مسلط کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ معلوم ہے کہ بنی اسرائیل کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا اور قوم نوح، قوم ہود، قوم صالح، قوم لوط، قوم شعیب اور اِس طرح کی بعض دوسری قومیں اِس کے برخلاف زمین سے مٹا دی گئیں۔

دوسری صورت کے لیے بھی یہی قانون ہے، لیکن اُس میں عذاب کا یہ فیصلہ رسول اور اُس کے ساتھیوں کی تلواروں کے ذریعے سے نافذ کیا جاتا ہے۔ اِس صورت میں، ظاہر ہے کہ قوم کو کچھ مہلت مل جاتی ہے۔ رسول اِس عرصے میں دار الہجرت کے مخاطبین پر اتمام حجت بھی کرتا ہے، اپنے اوپر ایمان لانے والوں کی تربیت اور تطہیر و تزکیہ کے بعد اُنھیں اِس معرکۂ حق و باطل کے لیے منظم بھی کرتا ہے اور دار الہجرت میں اپنا اقتدار بھی اِس قدر مستحکم کر لیتا ہے کہ اُس کی مدد سے وہ منکرین کے استیصال اور اہل حق کی سرفرازی کا یہ معرکہ سر کر سکے۔‘‘(میزان ۵۴۳-۵۴۴)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الاحزاب

(۵)

(گذشتہ سے پیوستہ)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ
اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ
وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿٤٩﴾

(اِس نکاح کے لیے کسی عدت کی ضرورت نہیں ہے، جس کا حکم ہم نے پیغمبر کو دیا ہے)۔ ایمان والو، (اِس لیے کہ) جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرتے ہو،[100] پھر ہاتھ لگانے سے پہلے اُن کو طلاق دے دیتے ہو تو اُن پر تمھاری خاطر کوئی عدت لازم نہیں ہے جس کا تم شمار کرو گے۔[101]

۱۰۰۔ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ نکاح اصلاً مسلمان عورتوں ہی سے جائز ہے۔ اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ اِس کی اجازت ایک استثنا ہے جس سے اُسی صورت میں فائدہ اٹھانا چاہیے، جب ماحول میں اسلام اور اسلامی تہذیب کا غلبہ ہو۔

۱۰۱۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ عدت کی پابندی کا حکم دیا ہی اِس لیے گیا ہے کہ عورت کے حاملہ ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ ہو جائے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ حمل کا امکان ہو تو عدت عورت پر ایک حق واجب ہے، جیسا کہ 'عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ' کے الفاظ سے واضح ہے۔ لیکن اِس کا امکان نہ ہو تو عدت کی کوئی پابندی نہیں ہے، اِس

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْۤ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ

لیکن (اِس صورت میں بھی ضروری ہے کہ) اُنھیں کچھ سامان زندگی دو اور اُن کو بھلے طریقے سے رخصت کرو۔[102] ۴۹

(اور اِس کے لیے کسی بیوی کو طلاق دینے کی ضرورت بھی نہیں ہے، اِس لیے کہ اِس نکاح کے باوجود) ہم نے تمھاری سب بیویوں کو، جن کے مہر تم ادا کر چکے ہو، تمھارے لیے جائز ٹھیرا دیا

صورت میں طلاق کے فوراً بعد عورت کا نکاح کسی دوسرے شخص سے کیا جا سکتا ہے۔ قرآن نے یہاں اِس قانون کا حوالہ اصلاً تو اُنھی اعتراضات کے سد باب کے لیے دیا ہے جو فتنہ پردازی کے اُس ماحول میں اِس بات پر بھی کیے جا سکتے تھے کہ اُدھر زید نے طلاق دی اور اِدھر سیدہ زینب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں دینے کا اعلان کر دیا گیا، لیکن اِس کے ساتھ یہ بات بھی نہایت لطیف طریقے سے واضح کر دی ہے کہ وہ کیا صورت حال تھی جس میں زید رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بار بار روکنے کے باوجود بالآخر اِسی نتیجے پر پہنچے کہ اُنھیں سیدہ کو طلاق دے دینی چاہیے۔ قرآن کے اِس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ کم و بیش ایک سال اُن کے نکاح میں رہیں، مگر اُن کی شخصیت سے زید رضی اللہ عنہ کی مرعوبیت کا یہ عالم تھا کہ اِس پورے عرصے میں وہ اُن کے ساتھ ایک مرتبہ بھی زن و شو کا تعلق قائم کرنے کی جرأت نہیں کر سکے۔ چنانچہ خود بیان کرتے ہیں کہ طلاق کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مجھے آپ کی طرف سے نکاح کا پیغام دینے کے لیے بھیجا تو اُن کو دیکھ کر اُن کی ایسی عظمت میرے دل میں پیدا ہوئی کہ میں اُن کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ بھی نہیں سکا۔*

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات صرف اِس چیز کی وضاحت کے لیے بیان فرمائی ہے کہ طلاق کے فوراً بعد سیدہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں دینے کا اعلان کیوں کیا گیا۔ آپ اُن کو اپنے گھر میں کب لائے؟ اِس کا اِس وضاحت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۱۰۲۔ یعنی اِس صورت میں بھی کہ تم نے اُنھیں ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ اِس کی وضاحت سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۲۴۱ کے تحت ہو چکی ہے۔

* مسلم، رقم ۳۴۹۱۔

ہے،[۱۰۳] اے نبی۔ اور (صرف اُنھی کو نہیں، اُن کے ساتھ) اُن (خاندانی عورتوں[۱۰۴]) کو بھی جائز

۱۰۳۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی خواہش سے اور ازدواج کی فطری ضرورتوں کے تحت پوری زندگی میں صرف تین نکاح کیے ہیں: ایک حضرت خدیجہ سے، دوسرا اُن کی وفات کے بعد اپنی بچیوں کی نگہداشت اور گھر در کے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے ایک بیوہ اور سن رسیدہ خاتون حضرت سودہ سے اور تیسرا حضرت عائشہ سے جو اپنی غیر معمولی ذہانت و فطانت کی بنا پر اُس علم و حکمت کی سب سے بڑی معلمہ بن کر آپ کے گھر میں رہیں جو خدا نے آپ کو عطا فرمایا تھا۔ اِس کے علاوہ آپ نے جتنے نکاح کیے ہیں، خدا کے رسول کی حیثیت سے اپنی دینی اور اخلاقی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے کیے ہیں۔ چنانچہ سیدہ حفصہ سے آپ نے اپنے انتہائی قریبی ساتھی سیدنا عمر کی دل داری کے لیے نکاح کیا جو اپنی بیٹی کے بیوہ ہو جانے کے بعد اُس کی شادی کے لیے سخت پریشان تھے اور سیدہ زینب بنت خزیمہ اور سیدہ ام سلمہ سے اِس لیے کہ دونوں کے شوہر اُن جنگوں میں شہید ہو گئے تھے جو آپ ہی پر ایمان لانے کی وجہ سے اُن کو لڑنی پڑی تھیں۔*

زینب بنت جحش کے ساتھ نکاح کا حکم آپ کو اللہ تعالیٰ نے اُن کی تالیف قلب اور ایک رسم جاہلی کی اصلاح کے لیے دیا۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ اِس کا حکم آپ کو دیا گیا تو اُس وقت چار بیویاں، حضرت سودہ، حضرت عائشہ، حضرت حفصہ اور حضرت ام سلمہ آپ کے نکاح میں موجود تھیں۔ یہ معلوم ہے کہ چار سے زیادہ بیویاں کسی مسلمان کے نکاح میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اِس لیے یہ سوال پیدا ہوا کہ اِس حکم کی تعمیل کے لیے کیا پہلے سے موجود کسی بیوی کو طلاق دینا پڑے گی؟ قرآن نے یہ اِسی سوال کا جواب دیا ہے کہ آپ کے لیے یہ ضروری نہیں ہے اور آگے مزید وضاحت کر دی ہے کہ عام مسلمانوں سے الگ نکاح و طلاق کا ایک خصوصی قانون آپ کے لیے نازل کیا جا رہا ہے جس کی رو سے آپ اگر چاہیں تو درج ذیل مقاصد سے مزید نکاح بھی کر سکتے ہیں:

۱۔ اُن خاندانی عورتوں کی عزت افزائی کے لیے جو آپ کے کسی جنگی اقدام کے نتیجے میں قیدی بن کر آپ کے قبضے میں آ جائیں۔

۲۔ اپنی اُن چچازاد، ماموں زاد، پھوپھی زاد اور خالہ زاد بہنوں کی تالیف قلب کے لیے جنھوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی اور اِس طرح اپنا گھر بار اور اپنے اعزہ و اقربا، سب کو چھوڑ کر آپ کا ساتھ دیا ہے۔

۳۔ اُن خواتین کی دل داری کے لیے جو محض حصول نسبت کی غرض سے آپ کے ساتھ نکاح کی خواہش مند

* الطبقات الکبریٰ، ابن سعد ۸/ ۹۶، ۱۱۶، ۱۲۰، ۱۳۲۔

يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ
وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ز وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ
اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ق خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ط قَدْ عَلِمْنَا

ٹھیرا دیا ہے جو اللہ نے تمھیں غنیمت میں دیں اور وہ اُن میں سے تمھاری ملکیت میں آگئی ہوں اور تمھارے چچا کی بیٹیاں اور پھوپھیوں کی بیٹیاں اور ماموؤں کی بیٹیاں اور تمھاری خالاؤں کی بیٹیاں جنھوں نے تمھارے ساتھ ہجرت کی ہے اور کوئی مسلمان عورت، اگر وہ اپنے آپ کو نبی کے لیے ہبہ کر دے، اگر نبی اُس کو نکاح میں لینا چاہے۔[۱۰۵] یہ حکم دوسرے مسلمانوں سے الگ خاص تمھارے

ہوں اور آگے بڑھ کر اپنے آپ کو ہبہ کر دیں۔

چنانچہ سیدہ جویریہ اور سیدہ صفیہ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے مقصد سے نکاح کیا۔ سیدہ ام حبیبہ دوسرے مقصد سے آپ کی ازواج میں شامل ہوئیں اور سیدہ میمونہ کے ساتھ آپ کا نکاح تیسرے مقصد کے پیش نظر ہوا۔

۱۰۴۔ آیت میں 'وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ' کے بعد 'مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ' کے الفاظ بھی ہیں۔ یہ اِسی وضاحت کے لیے آئے ہیں کہ 'مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ' سے یہاں لونڈیاں نہیں، بلکہ وہ خاندانی عورتیں مراد ہیں جو کسی جنگ میں قید ہو کر آئیں اور اپنے حالات اور اپنی خاندانی وجاہت کی بنا پر اِس کی مستحق ہوں کہ حضور ہی اُن کے ساتھ نکاح کریں جس سے اُن کے اُس صدمے کا مداوا ہو سکے جو جنگ میں اسیر ہو جانے سے اُنھیں پہنچا ہے۔ یہ نکاح، ظاہر ہے کہ اُن عورتوں کو آزاد کر کے اُن کی رضامندی سے کیے جائیں گے۔

۱۰۵۔ ہبہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے ہر حق سے دست بردار ہو کر کوئی عورت اپنے آپ کو کسی کے حوالے کر دے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... یہ ایک انتہائی ایثار نفس کی صورت ہے جس کا جذبہ، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محض شرف نسبت حاصل کرنے کے لیے متعدد صحابیات کے اندر موجود تھا اور اُنھوں نے حضور سے اِس کا اظہار بھی کیا۔ حضور کی گھریلو زندگی، ہر شخص کو معلوم ہے کہ فقر و فاقہ کی زندگی تھی۔

مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ
عَلَيْكَ حَرَجٌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۵۰﴾ تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُـْٔوِيْٓ

لیے ہے۔[۱۰۶] ہم کو معلوم ہے جو کچھ ہم نے اُن کی بیویوں اور اُن کی لونڈیوں کے معاملے میں اُن پر فرض کیا ہے۔ اِس لیے خاص تمھارے لیے ہے کہ (اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں) تم پر کوئی تنگی نہ رہے،[۱۰۷] اور اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ (اور بیویوں کے حقوق زوجیت

...امہات المومنین کی غریبانہ زندگی ہی کی بنا پر منافقات اُن کے اندر وسوسہ اندازی کرتی رہتی تھیں کہ اگر وہ طلاق حاصل کر لیں تو وقت کے بڑے بڑے سردار اُن کو نکاح کے پیغام دیں گے اور اُن کی یہ فقر و فاقہ کی زندگی عیش و عشرت کی زندگی سے بدل جائے گی۔ اِس طرح کی غریبانہ زندگی کے لیے، ظاہر ہے کہ کوئی عورت دنیا کی کوئی طمع پیش نظر رکھ کر یہ بازی نہیں کھیل سکتی تھی کہ وہ اپنے آپ کو ہبہ کر دے۔ یہ قربانی تو وہی خواتین کر سکتی تھیں جن کے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے عقیدت و فدویت کا ایسا جذبہ ہو کہ وہ حضور کی خدمت کی سعادت حاصل کرنے کے لیے اپنی زندگی کا ہر ارمان قربان کر دینے کے لیے تیار ہوں۔ یہ جذبہ ایک نہایت پاکیزہ اور اعلیٰ جذبہ تھا، اِس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اِس کا لحاظ فرمایا اور حضور کو یہ اجازت دی کہ اگر کوئی مومنہ اپنے آپ کو اِس طرح ہبہ کر دے اور حضور اُس کو اپنے عقد نکاح میں لینا چاہیں تو لے سکتے ہیں۔ 'اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا' کی قید سے یہ بات نکلتی ہے کہ ہر چند یہ جذبہ نہایت محمود اور پاکیزہ ہے، لیکن اِس کی حوصلہ افزائی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے زیادہ ممکن نہیں ہے۔ اِس وجہ سے یہ معاملہ کلیتاً آپ کی صواب دید پر منحصر ہے کہ کسی کی اِس طرح کی پیش کش کو آپ قبول کریں یا نہ کریں۔''

(تدبر قرآن ۶/۲۵۵)

۱۰۶۔ یعنی ایک خاص دائرے میں نکاح کی پابندی اور چار سے زیادہ بیویوں کی یہ اجازت صرف تمھارے لیے ہے، یہ عام مسلمانوں کے لیے نہیں ہے۔ اِس سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کے کچھ احکام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص ہیں، ان میں دوسرے مسلمان آپ کے ساتھ شریک نہیں ہیں۔

۱۰۷۔ یعنی جن دینی اور اخلاقی مصالح کی خاطر یہ اجازت دی گئی ہے، اُنھیں آپ بغیر کسی زحمت کے پورا کر سکیں۔ اِن مصالح کی وضاحت ہم نے اوپر کر دی ہے۔

اِلَيۡكَ مَنۡ تَشَآءُ ؕ وَمَنِ ابۡتَغَيۡتَ مِمَّنۡ عَزَلۡتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكَ ؕ ذٰلِكَ اَدۡنٰۤى
اَنۡ تَقَرَّ اَعۡيُنُهُنَّ وَلَا يَحۡزَنَّ وَيَرۡضَيۡنَ بِمَاۤ اٰتَيۡتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ مَا فِىۡ
قُلُوۡبِكُمۡ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَلِيۡمًا ﴿۵۱﴾ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنۡۢ بَعۡدُ وَلَاۤ

میں برابری بھی اب تمھارے لیے ضروری نہیں ہے)۔[۱۰۸] تم اُن میں سے جسے چاہو الگ رکھو اور جسے چاہو اپنے پاس رکھو اور جن کو (کسی وقت) الگ رکھا تھا، اُن میں سے پھر کسی کو بلوا لو تو اِس میں بھی تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ (ہم نے یہ وضاحت اِس لیے کر دی ہے کہ اِس کے بعد) یہ زیادہ قرین ہے کہ اُن کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں گی اور وہ رنجیدہ نہ ہوں گی اور جو کچھ تم اُن کو دو گے، سب اُس پر راضی رہیں گی۔[۱۰۹] اللہ جانتا ہے جو کچھ تم لوگوں کے دلوں میں ہے اور اللہ علیم و حلیم ہے۔ اِن کے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۱۰۸۔ یعنی جب یہ نکاح آپ نے اپنی خواہش سے نہیں کیے، بلکہ دوسروں کی تالیف قلب اور دل داری کے لیے یا خدا کے کسی حکم کی تنفیذ کے لیے کیے ہیں تو یہ کسی طرح قرین انصاف نہیں ہے کہ بیویوں کے ساتھ بالکل یکساں تعلق رکھنے کا حکم آپ کے لیے بدستور قائم رکھا جائے۔ چنانچہ یہ پابندی بھی آپ سے اٹھا دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ایک رعایت تھی اور حضور اگر چاہتے تو اِس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے، لیکن آپ کے تمام سیرت نگار اِس پر متفق ہیں کہ اِس آزادی کے باوجود آپ نے اپنے اوپر عدل و انصاف کی پابندی پوری طرح قائم رکھی اور آخر عمر تک کبھی اِس کی خلاف ورزی نہیں کی۔

۱۰۹۔ چنانچہ خانگی زندگی میں آپ کے لیے کوئی الجھن اِس کے نتیجے میں پیدا نہیں ہو گی اور آپ پورے سکون کے ساتھ اپنے فرائض ادا کر سکیں گے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... یہ ازواج مطہرات کو تشویق و ترغیب ہے کہ وہ اپنے اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تعلق کو عام میاں بیوی کے تعلق کی کسوٹی پر نہ پرکھیں، بلکہ پیغمبر کی اصل ذمہ داری اور اپنی اصل حیثیت کو سامنے رکھ کر جانچیں۔ اصل چیز زاویۂ نگاہ ہے۔ اگر اُس میں تبدیلی ہو جائے گی اور وہ یہ سمجھ جائیں گی کہ پیغمبر کے ساتھ اُن کا اصل تعلق صرف میاں بیوی کا نہیں، بلکہ خدمت دین کا ہے تو پھر حقوق کے معاملے میں نہ باہم ازواج میں کوئی رقابت ہو گی اور نہ پیغمبر ہی سے کوئی گلہ و شکوہ رہے گا، بلکہ اپنے مصروف لمحات میں سے پیغمبر جو کچھ جس

اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ رَّقِيْبًا ﴿۵۲﴾

بعد اب دوسری عورتیں تمھارے لیے جائز نہیں ہیں اور نہ یہ جائز ہے کہ اِن کی جگہ اور بیویاں لے آؤ، اگرچہ اُن کا حسن تمھیں کتنا ہی پسند ہو۔[۱۱۰] تمھاری لونڈیاں، البتہ مستثنیٰ ہیں۔[۱۱۱] اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔[۱۱۲] ۵۰-۵۲

کو بخش دیں گے، وہ اُسی پر قناعت کریں گی۔ زاویۂ نگاہ کی تبدیلی کے بعد دینی خدمت کے اعتبار سے جس کا مرتبہ بلند ہو گا، اُس کی قدر جس طرح نبی کی نظروں میں ہو گی، اُسی طرح آپ کی ازواج کی نگاہوں میں بھی ہو گی اور باہمی رشک ورقابت کی تمام تلخیاں کافور ہو جائیں گی۔‘‘(تدبر قرآن ۶/ ۲۵۷)

۱۱۰۔ یعنی آپ کے لیے جو دائرہ مقرر کر دیا گیا ہے، اُس سے باہر نہ آپ اب کوئی نکاح کر سکتے ہیں اور نہ ازواج میں مجرد پسند اور ناپسند کی بنا پر کوئی تبدیلی فرما سکتے ہیں۔ یہ پابندی، ظاہر ہے کہ عام لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ آپ کو اگرچہ بعض معاملات میں آزادی دی گئی، لیکن دوسری طرف آپ پر ایسی پابندیاں بھی عائد کر دی گئی ہیں کہ نکاح و طلاق، دونوں ہی کے معاملے میں آپ دوسرے مسلمانوں کے مقابل میں کہیں زیادہ پابند ہو گئے ہیں۔

۱۱۱۔ اُس وقت کے حالات میں یہ استثنا ضروری تھا، اِس لیے کہ جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنانے کی ممانعت کے باوجود غلامی ابھی عملاً ختم نہیں ہوئی تھی۔ قرآن نے اِسی بنا پر اِسے عام مسلمانوں کے معاملے میں بھی ہر جگہ برقرار رکھا ہے۔ چنانچہ حضرت ماریہ اِسی حیثیت سے آپ کے پاس رہیں اور اُن کے بطن سے آپ کے صاحب زادے حضرت ابراہیم پیدا ہوئے۔

۱۱۲۔ اِس تذکیر و تنبیہ کے مخاطب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اوپر اِسی نوعیت کی تذکیر و تنبیہ ازواج مطہرات کو کی گئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

’’...اِس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ہاں ہر ایک مسئول ہے اور جو جتنا ہی بڑا ہے، اتنا ہی زیادہ مسئول ہے۔ اِس وجہ سے ہر ایک کے لیے ضروری ہوا کہ خدا کے مواخذے سے پہلے اپنا محاسبہ کرتا ہے اور اِس یقین کے ساتھ محاسبہ کرتا رہے کہ اُس کی زندگی کا کوئی گوشہ بھی خدا کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے۔‘‘(تدبر قرآن ۶/ ۲۵۸)

[باقی]

محمد عمار خان ناصر

”میزان“ ـــــ توضیحی مطالعہ

قانون سیاست

(۴)

تنفیذ احکام میں حکومت کا دائرۂ اختیار

”مسلمانوں کے ارباب حل و عقد اُن کو کسی جرم کے ارتکاب سے روک سکتے اور اُس پر سزا تو دے سکتے ہیں، لیکن دین کے ایجابی تقاضوں میں سے نماز اور زکوٰۃ کے علاوہ کسی چیز کو بھی قانون کی طاقت سے لوگوں پر نافذ نہیں کر سکتے۔ وہ، مثال کے طور پر، اُنھیں روزہ رکھنے کا حکم نہیں دے سکتے۔ اُن میں سے کسی شخص کے بارے میں یہ معلوم ہو جانے کے باوجود کہ وہ صاحب استطاعت ہے، اُسے حج پر جانے کے لیے مجبور نہیں کر سکتے۔ جہاد و قتال کے لیے جبری بھرتی کا کوئی قانون نافذ نہیں کر سکتے۔ مختصر یہ کہ جرائم کے معاملے میں اُن کا دائرۂ اختیار آخری حد تک وسیع ہے، لیکن شریعت کے اوامر میں سے اِن دو ـــــ نماز اور زکوٰۃ ـــــ کے سوا باقی سب معاملات میں یہ صرف ترغیب و تلقین اور تبلیغ و تعلیم ہی ہے جس کے ذریعے سے وہ مسلمانوں کی اصلاح کے لیے جدوجہد کر سکتے ہیں۔ اِس طرح کے تمام معاملات میں اِس کے سوا کوئی چیز اُن کے دائرۂ اختیار میں نہیں ہے۔“ (میزان ۴۹۴)

مصنف کا یہ نقطۂ نظر مختلف پہلوؤں سے توضیح کا متقاضی ہے۔ اس سے متعلق بنیادی تنقیح طلب نکات حسب ذیل ہیں:

۱۔ ریاست کے دائرۂ اختیار سے متعلق مصنف کے نقطۂ نظر کی تفصیل۔

۲۔ روایتی اہل علم کے نقطۂ نظر سے مصنف کا اختلاف۔

۳۔ سورۂ توبہ کی آیت سے استدلال۔

ذیل میں ان تینوں پہلوؤں سے مصنف کے موقف کی ضروری توضیح پیش کی جائے گی۔

مصنف کے نقطۂ نظر کی تفصیل

اس نکتے سے متعلق مصنف کے نقطۂ نظر کی تفصیلات جو ان کی دوسری تحریروں میں موجود ہیں، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے مصنف کا پورا موقف درج ذیل نکات کی صورت میں متعین کیا جا سکتا ہے:

۱۔ ''اسلام اور ریاست — ایک جوابی بیانیہ'' کے زیر عنوان مصنف نے واضح کیا ہے کہ اسلامی شریعت میں مسلمانوں کو دو طرح کے احکام دیے گئے ہیں: ایک وہ جن کا مخاطب فرد بہ حیثیت فرد ہے اور دوسرے وہ جن کا روے سخن مسلمان معاشرے کی طرف ہے اور جن کو روبہ عمل کرنے کی ذمہ داری نظم اجتماعی پر عائد ہوتی ہے۔ پہلی قسم کی مثال کے طور پر مصنف نے روزہ رکھنے، حج و عمرہ کے لیے جانے، ختنہ کرانے، مونچھیں پست رکھنے، خواتین کے لیے سینہ ڈھانپنے، زیب و زینت کی نمایش نہ کرنے اور سر پر اسکارف لینے جیسے معاملات کا ذکر کیا ہے۔ دوسری قسم کے احکام کے تحت مصنف نے ایک تفصیلی فہرست دی ہے جس میں مسلمانوں کے مابین عدل و انصاف کا قیام، ان کے تنازعات کا شریعت کے مطابق فیصلہ، اجتماعی عبادات میں مسلمانوں کو ضروری سہولیات مہیا کرنا، قومی املاک کا بندوبست، نماز جمعہ و عیدین کا اہتمام، معاہدات کی پابندی، جرائم پر شرعی سزاؤں کا نفاذ اور دعوت اسلام کی راہ میں رکاوٹیں دور کرنے کے لیے جہاد جیسے امور شامل ہیں۔

۲۔ مسلمانوں کا نظم اجتماعی جن ذمہ داریوں کے لیے مسئول ہے، ان میں سے ایک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ہے۔ اس ذمہ داری کی بجا آوری کے لیے ریاستی ادارے مسلمانوں کے مابین معروفات کے فروغ اور منکرات کے سدباب کے لیے تلقین اور تعلیم و تربیت کے لیے ضروری اقدامات کرنے کے پابند ہیں۔ تاہم مسلمانوں کو قانون کی طاقت سے کسی معروف کا پابند بنانے یا کسی منکر سے باز رکھنے کا ریاستی اختیار مصنف کے نزدیک مطلق نہیں ہے، بلکہ کچھ حدود کا پابند ہے (مقامات، اسلام اور ریاست — ایک جوابی بیانیہ)۔

۳۔ جہاں تک شریعت کے ایجابی احکام، یعنی مامورات کا تعلق ہے تو ان میں سے صرف نماز اور زکوٰۃ ایسے دو امور ہیں، جن کا مطالبہ نظم اجتماعی مسلمان شہریوں سے قانون کی طاقت سے کر سکتا ہے۔ ان کے علاوہ باقی تمام

امور میں فرد صرف خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ ان امور میں تعلیم و تربیت اور تلقین و نصیحت سے آگے حکومت کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے اور وہ مسلمانوں کو بہ زور قانون کسی چیز کا پابند نہیں بنا سکتی (مقامات، اسلام اور ریاست —— ایک جوابی بیانیہ)۔ اوپر نقل کیے گئے اقتباس میں مصنف نے اس کی مثال کے طور پر کسی مسلمان کو جبراً روزہ رکھوانے، حج پر بھیجنے یا جہاد کے لیے بھرتی کرنے جیسے امور کا ذکر کیا ہے۔

۴۔ نہی عن المنکر کے تعلق سے مصنف کے نقطۂ نظر کا ایک بنیادی پہلو یہ ہے کہ ان کا مصداق مسلمہ اخلاقی برائیاں ہیں، چنانچہ ''نہی عن المنکر'' کے زیر عنوان اپنی تحریر میں مصنف نے لکھا ہے:

''اِس سے مراد وہ برائیاں نہیں ہیں جو خالص مذہبی احکام کی خلاف ورزی سے پیدا ہوتی ہیں، بلکہ وہ برائیاں ہیں جنھیں پوری انسانیت بلا امتیاز مذہب و ملت برائی سمجھتی ہے۔ چوری، جھوٹ، بد دیانتی، غبن، خیانت، ناپ تول میں کمی، ملاوٹ، حق تلفی، فواحش، جان، مال اور آبرو کے خلاف زیادتی اور اِس نوعیت کی دوسری برائیوں کو عربی زبان میں لفظ 'منکر' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔'' (مقامات ۲۶۵)

دوسرا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ منکرات کی روک تھام کے لیے تعلیم و تلقین سے آگے بڑھ کر قانون کی طاقت، مسلمانوں کی حکومت صرف ان معاملات میں بروے کار لا سکتی ہے جن کا تعلق دوسرے انسانوں کے جان و مال اور آبرو پر تعدی سے ہو۔ ان کے علاوہ دیگر منکرات میں بھی ریاست کا اختیار صرف تعلیم و تلقین تک محدود ہے۔ مصنف کے الفاظ میں:

''وہ لوگوں کو بھلائی کی تلقین کریں گے اور اُن سب چیزوں سے روکیں گے جنھیں انسان ہمیشہ سے برائی سمجھتا رہا ہے۔ تاہم قانون کی طاقت اُسی وقت استعمال کریں گے، جب کوئی شخص کسی کی حق تلفی کرے گا یا اُس کی جان، مال یا آبرو کے خلاف کسی اقدام کے درپے ہو گا۔'' (مقامات ۲۰۶)

۵۔ مذکورہ تمام مقدمات کی روشنی میں مصنف نے ریاست کے دائرۂ اختیار کے حوالے سے اپنے نقطۂ نظر کو جامع انداز میں ''قانون کی بنیاد'' کے زیر عنوان اپنی تحریر میں بیان کیا ہے۔ مصنف نے واضح کیا ہے کہ انسان کو آزاد پیدا کیا گیا ہے اور اس کے اختیار اور آزادی پر عائد کی جانے والی کسی بھی پابندی کی کوئی اخلاقی بنیاد ہونا چاہیے۔ وہ بنیاد یہی ہے کہ اگر انسان کسی دوسرے انسان کی حق تلفی کرنا چاہے یا کسی کے جان و مال یا آبرو کے خلاف کوئی اقدام کرے تو اس کی آزادی کو سلب کر لیا جائے۔ اسی اصول کی روشنی میں مصنف کے نزدیک مسلمانوں کی حکومت کو قتل، زنا، چوری، قذف اور حرابہ کی شرعی سزائیں اور اسی طرح شراب نوشی کی تعزیری سزا مجرموں پر نافذ کرنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح نکاح و طلاق اور وراثت وغیرہ کے معاملات میں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اگر مسلمان شریعت کے احکام کے مطابق ایک دوسرے کے حقوق ادا نہ کریں تو ریاست کو انھیں باہمی حق تلفی سے بچانے کے لیے مداخلت کا حق حاصل ہے۔ اسی نوعیت کی مختلف قدغنیں، مثلاً کم سنی کی شادی اور پہلی بیوی کی رضامندی کے بغیر دوسری شادی پر پابندی اجتہاداً بھی عائد کی جاسکتی ہیں۔

۶۔ نظم اجتماعی کے قانونی اختیار کو مثبت پہلوؤں سے واضح کرنے کے بعد مصنف نے اس اختیار کے غلط استعمال کی بہت سی مثالوں کا بھی ذکر کیا ہے جن سے مصنف کا نقطۂ نظر اطلاق وانطباق کی سطح پر بہت واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ مصنف نے لکھا ہے:

> ''دنیا کی ہر حکومت اور ہر قانون ساز ادارہ پابند ہے کہ وہ اپنے قانون اور ضابطوں کا جواز اِسی سے ثابت کرے اور لوگوں کا حق ہے کہ وہ اُس کے بنائے ہوئے قوانین کا جائزہ لیں اور اگر دیکھیں کہ کوئی قانون یا ضابطہ اِس اصول سے ہٹ کر بنایا گیا ہے تو اُسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔ چنانچہ کسی حکومت نے اگر، مثال کے طور پر، یہ قانون بنایا ہے کہ لوگ اپنی مذہبی علامتوں، جیسے زنار اور صلیب اور پگڑی اور کرپان وغیرہ کا اظہار نہیں کریں گے یا بیوی کو طلاق دیں گے تو اپنے اموال کا اتنا اور اتنا حصہ لازماً اُس کے حوالے کر دیں گے یا ڈاڑھی نہیں منڈوائیں گے یا نیکر نہیں پہنیں گے یا موسیقی نہیں سنیں گے یا عورتیں نقاب نہیں پہنیں گی یا سر پر اسکارف نہیں لیں گی یا اِس کے برخلاف یہ قانون بنایا ہے کہ وہ نقاب کے بغیر باہر نہیں نکلیں گی یا محرم کے بغیر حج و عمرہ کے لیے نہیں آئیں گی یا گاڑی نہیں چلائیں گی یا فلاں اور فلاں پیشہ اختیار نہیں کریں گی یا سیاست میں حصہ نہیں لیں گی یا ووٹ نہیں دیں گی تو یقیناً حدود سے تجاوز کیا ہے۔'' (مقامات ۲۳۷)

مصنف کے بیان کردہ اصولوں کو پیش نظر رکھا جائے تو مذکورہ تمام امور حسب ذیل تفصیل کے مطابق ریاست کے دائرۂ اختیار سے تجاوز قرار پاتے ہیں:

۱۔ مذہبی علامات، مثلاً زنار، صلیب اور کرپان وغیرہ کے اظہار پر پابندی اس لیے جائز نہیں کہ یہ مسلمانوں کے مذہبی عقیدے کی رو سے تو منکر ہیں، لیکن ان کی نوعیت مسلمہ اخلاقی برائیوں کی نہیں ہے۔ مصنف نے ''ریاست و حکومت'' کے عنوان سے اپنی تحریر میں واضح کیا ہے کہ غیر اسلامی شعائر وعلامات کا اظہار یا غیر مسلموں کا قیام صرف جزیرۂ عرب میں ممنوع ہے جسے اللہ کے ایک فیصلے کے تحت اسلام کے لیے خاص کر دیا گیا ہے (مقامات، ریاست و حکومت)۔

۲۔ بیوی کو طلاق دینے کی صورت میں اسے شوہر کے مال کے ایک مخصوص حصے کا حق دار نہ تو شریعت میں ٹھیرایا گیا ہے اور نہ میاں بیوی نے آزادانہ کسی معاہدے کے تحت یہ پابندی قبول کی ہے، اس لیے ریاست کے

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

پاس جبراً انھیں اس کا پابند بنانے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔

۳۔ ڈاڑھی منڈوانا، نیکر پہننا یا موسیقی سننا مسلمہ اخلاقی برائیوں میں شامل نہیں۔ ان کا شرعی عدم جواز خود مسلمانوں کے مابین بھی متفقہ نہیں اور اگر ہو بھی تو ان میں جرم، یعنی کسی دوسرے کے حق پر زیادتی کا پہلو نہیں پایا جاتا۔ چنانچہ ان امور میں بھی حکومت زیادہ سے زیادہ ترغیب و نصیحت اور تلقین و تعلیم ہی کا طریقہ بروے کار لا سکتی ہے۔

۴۔ خواتین کو نقاب پہننے یا سر پر اوڑھنی لینے سے روکنا بھی اسی لیے دائرۂ اختیار سے تجاوز ہے کہ سر یا چہرے کو ننگا رکھنا نہ مسلمہ معروفات میں سے ہے اور نہ ان کو ڈھانپنا مسلمہ اخلاقی برائیوں میں شامل ہے۔

۵۔ اسی اصول پر کسی مسلمان خاتون کو نقاب پہننے کا پابند نہیں بنایا جا سکتا، کیونکہ یہ اگر شریعت کا مطلوب ہو بھی تو مسلمان ریاست نماز اور زکوٰۃ کے علاوہ کوئی ایجابی شرعی حکم جبراً نافذ نہیں کر سکتی۔ اسی طرح محرم کے بغیر سفر کرنے یا گاڑی چلانے یا سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر شریعت میں اول تو کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی اور بالفرض کی بھی گئی ہو تو ان کی پابندی کا فرد اپنی انفرادی حیثیت میں مخاطب ہے۔ چونکہ ان میں کسی دوسرے پر زیادتی یا حق تلفی کا پہلو نہیں پایا جاتا، اس لیے ریاست تعلیم و تلقین سے آگے بڑھ کر انھیں قانونی جبر سے نافذ نہیں کر سکتی۔

www.javedahmedghamidi.com www.al-mawrid.org

روایتی موقف سے اختلاف

مصنف کے مذکورہ نقطۂ نظر میں اہل علم کے عمومی اور روایتی موقف سے اختلاف کے اہم پہلو دو ہیں:

پہلا یہ کہ اسلامی روایت میں سیاست شرعیہ پر کلام کرنے والے اہل علم کے ہاں اس سوال سے تصریحاً تعرض نہیں ملتا کہ احکام شرعیہ کی تنفیذ میں حکمران کا دائرۂ اختیار کیا ہے۔ البتہ ارباب حل و عقد کی دینی ذمہ داریوں کا ذکر کرتے ہوئے عموماً جن امور کا ذکر کیا جاتا ہے، ان کا تعلق عبادات میں نماز کی اقامت یا حج کی سہولیات مہیا کرنے سے اور عام معاشرتی امور میں مختلف منکرات سے ہی ہوتا ہے۔ مثلاً قاضی بدر الدین ابن جماعۃ حسبہ کے ریاستی شعبے کے وظائف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الحسبة وحقيقتها ولاية الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر ... والذي عليه من الوظائف فثلاثة أنواع:	”حسبہ کی حقیقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اختیار کو بروے کار لانا ہے۔ محتسب کی ذمہ داریاں تین قسم کی ہیں: پہلی قسم حقوق اللہ

الأول حقوق الله تعالیٰ، فينظر من يخل بالواجبات من الطهارة والصلوات والجمعة والجماعات، ومن يرتكب المنكرات كإظهار المحرمات وشرب المسكرات وكشف العورات لاسيما في الحمامات، فيزجر فاعل ذلك ويؤدبه بما يقتضيه الحال - النوع الثاني: حقوق العباد المختصة، وهو النظر في الموازين والمكاييل وصحتها على العرف المألوف في بلده ... النوع الثالث: ما يشترك فيه حق الله تعالیٰ وحق العباد، ومنه النظر في الأرقاء والسادة وما يلزمهم شرعًا وعادة ... ومنه النظر في أهل الذمة.

(تحریر الاحکام فی تدبیر اہل الاسلام ۹۲)

سے متعلق ہے، چنانچہ محتسب ان لوگوں پر نظر رکھے گا جو دینی واجبات، مثلاً طہارت، نماز، جمعہ اور جماعات کی بجاآوری نہ کریں اور جو منکرات کا ارتکاب کریں، جیسے سر عام حرام کاموں کا ارتکاب اور نشہ آور مشروبات پینا اور برہنگی کا اظہار کرنا، خصوصاً اجتماعی غسل خانوں میں۔ محتسب موقع و محل کے مطابق ایسے لوگوں کی زجر وتادیب کرے گا۔ دوسری قسم کا تعلق بندوں کے باہمی حقوق سے ہے، مثلاً ماپ تول کے پیمانوں پر نظر رکھنا اور اس کو یقینی بنانا کہ وہ اس علاقے کے معروف پیمانوں کے مطابق ہوں۔ تیسری قسم ان امور کی ہے جن میں اللہ کا حق اور بندوں کا حق، دونوں پائے جاتے ہیں۔ اسی کی قبیل سے غلاموں اور ان کے مالکوں کے معاملات پر نظر رکھنا اور ان پر شرعاً و عرفاً جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ان کو یقینی بنانا ہے۔ اہل ذمہ کے معاملات کی نگرانی بھی اسی کے تحت آتی ہے۔“

تاہم اس حوالے سے، خصوصاً خلفاے راشدین کے طرز عمل سے جو تصویر سامنے آتی ہے، وہ کچھ یوں ہے کہ سیدنا عمر عصر کے بعد مسجد میں نوافل ادا کرنے والوں کو درے لگایا کرتے تھے (مسلم، رقم ۸۳۶)۔ آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کا تہ بند ٹخنوں سے نیچے ہے تو قینچی منگوا کر ٹخنوں سے نیچے اس کے تہ بند کو کاٹ دیا (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۴۸۸۱)۔ ایک شخص کو سونے کی انگوٹھی پہنے ہوئے دیکھا تو اسے درہ لگا دیا (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۵۱۹۸)۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان، دونوں سے متعلق منقول ہے کہ وہ ایسی خواتین کو جو دوران عدت میں حج کے لیے نکلی ہوں، راستے سے واپس بھیج دیتے تھے (سنن سعید بن منصور، رقم ۱۳۴۴۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

مصنف عبد الرزاق، رقم ۱۲۰۷۱)۔ ان کی طرف سے امہات المومنین کو حج یا عمرے کے سفر پر از خود جانے کی اجازت نہیں تھی، اور اس کے لیے انھیں سیدنا عمر سے اجازت لینی پڑتی تھی (ابن حجر، فتح الباری ۴/ ۷۳-۷۴)۔ انھوں نے نصر بن الحجاج نامی ایک نوجوان کا سر منڈوا دیا، کیونکہ وہ بہت خوب صورت تھا اور مدینے کی خواتین اس کے نام سے عشقیہ شاعری کرنے لگی تھیں۔ پھر انھوں نے اس کو مدینہ سے جلاوطن کر کے بصرہ بھیج دیا (ابن سعد، الطبقات الکبریٰ ۳/ ۲۱۶۔ ابن عساکر، تاریخ دمشق ۶۲/ ۲۱)۔ اسی طرح سیدنا عثمان نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے گھروں سے نرد کو نکال دیں، ورنہ وہ ان کے گھروں کو جلا دیں گے (بیہقی، السنن الکبریٰ ۱۰/ ۲۱۵)۔ انھوں نے ایک شخص کو مامور کیا کہ جو لوگ کبوتر اڑاتے ہوں یا جلاہق کھیلتے ہوں، ان کے کبوتروں کے پر کاٹ دیں اور جلاہق کو توڑ دیں (ابن کثیر، البدایہ والنہایہ ۷/ ۲۱۴)۔

اس تناظر میں اسلامی روایت اصولی طور پر حکمران کے اختیار کو کسی خاص اور متعین ضابطے کا پابند نہیں کرتی۔ یوں مصنف کا نقطۂ نظر اس سوال کے حوالے سے روایتی دینی تفہیم سے کافی مختلف ہو جاتا ہے۔

اختلاف کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ مصنف نے حکومت کے دائرۂ اختیار کو منکرات کے ضمن میں صرف جرائم سے متعلق قرار دیا ہے جس سے مصنف کی مراد حقوق العباد پر تعدی کی نوعیت رکھنے والے جرائم ہیں۔ یہ نقطۂ نظر بھی روایتی فقہی موقف سے مختلف ہے۔ روایتی اہل علم نہ صرف ارتداد کی سزا کو حدود میں شمار کرتے اور مرتد کے خلاف قانونی اقدام کو مسلمان حکومت کی ذمہ داری قرار دیتے ہیں، بلکہ اس کے علاوہ عمومی طور پر بدعات کے خاتمہ اور مختلف بدعتی گروہوں کی سرکوبی کو بھی مسلمان حکمران کی دینی ذمہ داریوں میں شمار کرتے ہیں (دیکھیے: الجوینی، غیاث الامم ۳۲۹-۳۳۰)۔

ارتداد سے متعلق مصنف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس کی سزا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے براہ راست مخاطبین میں سے مشرکین عرب کے لیے قانون اتمام حجت کے تحت بیان کی گئی تھی اور مشرکین عرب ہی کے ساتھ خاص ہے۔ اس دائرے سے باہر، ارتداد اختیار کرنے والے کسی شخص کو سزا دینے کا اختیار اسلامی حکومت کو حاصل نہیں ہے۔ مزید برآں، دین کے بنیادی تصورات اور احکام میں تحریف یا بدعت جیسے منکرات کے خلاف ریاستی طاقت کے استعمال کو بھی مصنف درست نہیں سمجھتے۔ اس ضمن میں کسی قول یا عمل کی بنیاد پر کسی کی تکفیر کرنے، یعنی اسے قانونی طور پر غیر مسلم قرار دینے کے متعلق مصنف کا نقطۂ نظر گذشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ اس کو ریاست کے دائرۂ اختیار میں شامل نہیں سمجھتے۔ مصنف کے نزدیک یہ دائرہ بھی دین کی شرح ووضاحت

اور دعوت و تلقین سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

سورۂ توبہ کی آیت سے استدلال

مذکورہ نقطۂ نظر کے حق میں مصنف نے سورۂ توبہ کی آیت ۵ سے استدلال کیا ہے، جس میں مشرکین عرب سے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ جب وہ شرک سے توبہ کر کے نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی پابندی قبول کر لیں تو ان کی راہ چھوڑ دی جائے۔ یہ ایک منفرد استنباط ہے۔ قدیم یا جدید اسلامی روایت میں اس آیت سے حکومتی دائرۂ اختیار سے متعلق کوئی ضابطہ اخذ کرنے کی کوئی نظیر بظاہر نہیں ملتی۔ مفسرین نے عموماً اس کو اس پر محمول کیا ہے کہ یہ شرائط پوری کرنے پر مشرکین کو جان و مال کی امان حاصل ہو جائے گی اور ان کے لیے معمول کی نقل و حرکت جائز ہو جائے گی۔ نواب صدیق حسن خان اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

(فخلوا سبیلهم) أي اتركوهم وشأنهم فلا تأسروهم ولا تحصروهم ولا تقتلوهم ولا تمنعوهم من الدخول إلى مكة والتصرف في بلادهم ولا تتعرضوا لهم. (فتح البیان)

’’’’ان کا راستہ چھوڑ دو‘‘ کا مطلب یہ ہے کہ ان پر کوئی پابندی نہ لگاؤ، ان کو قید نہ کرو، نہ ان کا محاصرہ کرو، نہ قتل کرو اور نہ مکہ میں داخل ہونے یا اپنے ملک میں نقل و حرکت سے روکو اور نہ انھیں کسی بھی طریقے سے تنگ کرو۔‘‘

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اسی سے اہل علم یہ عمومی ضابطہ بھی اخذ کرتے ہیں کہ اگر غیر مسلم دائرۂ اسلام میں داخل ہونا چاہیں تو اس کے لیے اقرار شہادت کے ساتھ ساتھ نماز اور زکوٰۃ کا اہتمام بھی ضروری ہے۔ تاہم اہل علم کے نزدیک نماز اور زکوٰۃ کا ذکر یہاں جامع مانع شرائط کے طور پر نہیں، بلکہ قبول اسلام کی دو بڑی علامات کے طور پر ہوا ہے۔ امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ یہاں خاص طور پر ان دو نمایاں اور ظاہر فرائض کا ذکر کیا گیا ہے جن کو اگر مسلمانوں کا کوئی گروہ ترک کرنا چاہے تو اس کے خلاف قتال کیا جا سکتا ہے۔ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ دیگر عبادات، مثلاً وضو اور غسل یا روزہ وغیرہ پوشیدہ امور ہیں جن کی ظاہری تحقیق نہیں ہو سکتی، اس لیے ظاہری طور پر کسی گروہ کو مسلمان شمار کرنے کے لیے نماز اور زکوٰۃ کے اہتمام کو ہی شرط قرار دیا گیا ہے (مجموع الفتاویٰ ۷/ ۶۰۷-۶۰۸)۔

مولانا شبیر احمد عثمانی کے الفاظ میں ’’اگر بظاہر کفر سے توبہ کر کے اسلامی برادری میں داخل ہو جائیں جس کی بڑی علامت نماز ادا کرنا اور زکوٰۃ دینا ہے تو پھر مسلمانوں کو ان سے تعرض کرنے اور ان کا راستہ روکنے کی اجازت نہیں‘‘ (تفسیر عثمانی، التوبہ، آیت ۵)۔

سید رشید رضا واضح کرتے ہیں کہ اس آیت کا موضوع اسلام کے فرائض وواجبات کا کوئی جامع بیان نہیں، بلکہ صرف قبول اسلام کی دو واضح اور بڑی علامات کا بیان ہے:

ولما كانت شرائع الإسلام القطعية من فعل وترك كثيرة وكان الكثير منها لا يتعلق به التكليف في حال الدخول في الإسلام كالصيام والحج من الأركان اكتفى باشتراط الركنين الاعظمين ... موضوع كل منهما بيان ما يشترط للكف عن قتال المشركين المحاربين لا بيان لجملة الإسلام وما ينافيه ويعد ارتداد عنه بعد الدخول فيه.

(المنار ۱۰/۲۰۵-۲۰۶)

''چونکہ اسلام کے قطعی احکام از قسم مامورات و منہیات بہت سے ہیں اور اسلام میں داخل ہوتے وقت ان میں سے زیادہ تر امور کی بجاآوری کی ذمہ داری انسان پر عائد نہیں ہوتی، جیسا کہ روزہ اور حج وغیرہ، اس لیے (قبول اسلام کے لیے) دو سب سے بڑے احکام پر اکتفا کی گئی۔ آیت اور حدیث کا موضوع ان شرائط کا بیان ہے جو برسر جنگ مشرکین کے خلاف قتال سے رکنے کے لیے ضروری ہیں۔ اسلام کے تمام احکام یا اسلام کے منافی یا اسلام سے ارتداد شمار ہونے والے تمام امور کا بیان ان کا موضوع نہیں۔''

سید قطب نے بھی ان آیات سے اور خصوصاً نماز اور زکوٰۃ کے ذکر پر اکتفا سے کسی عمومی شرعی قاعدے کے استنباط سے اختلاف کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں مشرکین عرب کے حوالے سے ایک خاص صورت حال زیر بحث ہے، اس لیے اس سے اسلام کے سیاسی نظام سے متعلق کوئی عمومی اصول اخذ کرنا درست نہیں۔ جہاں تک نماز اور زکوٰۃ کا تعلق ہے تو سید قطب کے نزدیک اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے علاوہ دیگر احکام کی پابندی کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا، بلکہ دراصل اس دور میں جو لوگ بھی دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے تھے، وہ پورے کے پورے داخل ہوتے تھے اور ان سے یہ خدشہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ قبول اسلام کی تمام شرائط کو پورا نہیں کریں گے (فی ظلال القرآن، اردو ترجمہ ۳/ ۴۷۲)۔

یہی رجحان مولانا اصلاحی کا بھی ہے جو نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کو ''اسلام کے نظام عبادت واطاعت میں داخل ہونے کی''، ''ایک جامع تعبیر قرار دیتے ہیں (تدبر قرآن ۳/ ۵۴۰)۔

مولانا مودودی نے اگرچہ ان آیات سے نومسلموں کے شہری حقوق کا دستوری ضابطہ اخذ کیا ہے (تفہیم القرآن،

التوبہ، حاشیہ نمبر ۱۴)۔ تاہم مولانا کا استنباط صرف اس نکتے تک محدود ہے کہ یہ شرائط پورا کرنے کے بعد نومسلموں کو دیگر تمام مسلمانوں کی طرح یکساں شہری حقوق حاصل ہو جائیں گے۔ مولانا اس سے حکومت کے دائرۂ اختیار کی تحدید کا نکتہ اخذ نہیں کرتے۔

مصنف کا نقطۂ نظر اہل علم کے مذکورہ عمومی رجحان سے مختلف ہے۔ مصنف کے نزدیک یہ آیت اپنے خاص سیاق کے لحاظ سے تو مشرکین عرب سے متعلق آئی ہے اور اس میں اسلام قبول نہ کرنے کی صورت میں ان کے قتل کا حکم اتمام حجت کے قانون پر مبنی ہے، تاہم اس میں ان کی جان بخشی کی جو شرائط بیان کی گئی ہیں، وہ صرف ان کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ یہ بطور مسلمان کسی بھی شخص کے شہری وسیاسی حقوق کے بنیادی شرائط ہیں۔ بہ الفاظ دیگر، مذکورہ شرائط کا ذکر محض قبول اسلام کی علامت کے طور پر یا جان بخشی کی کم سے کم شرائط کے طور پر نہیں ہوا، بلکہ یہاں ایک طرف یہ قرار دیا گیا ہے کہ اسلامی ریاست کے شہری حقوق سے بہرہ مند ہونے کے لیے نماز کا اہتمام اور زکوٰۃ کی ادائیگی ضروری ہے، اور دوسری طرف یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ ان دو مطالبات کی تکمیل کے بعد ایجابی طور پر ریاست ان کو دین کے کسی مزید حکم کی پابندی پر مجبور نہیں کر سکتی۔ مصنف کا استدلال یہ ہے کہ جب مشرکین عرب سے اس سے زیادہ کوئی مطالبہ ریاست کی طرف سے روا نہیں رکھا گیا تو ایک عمومی ضابطے کے طور پر بھی مسلمان شہریوں سے ایسا کوئی مطالبہ درست نہیں ہونا چاہیے۔

البتہ ان شرائط کی عملی تنفیذ کے حوالے سے مصنف کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں حکمت عملی اور مصلحت کا بھی دخل ہے اور نظم اجتماعی ''اگر چاہے تو'' (مقامات، اسلام اور ریاست — ایک جوابی بیانیہ) مسلمانوں سے بہ زور قانون ان کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس اقدام سے کوئی ناپسندیدہ نتیجہ پیدا ہونے کا خدشہ ہو تو از روے مصلحت اس سے گریز بھی کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مشرکین عرب کے لیے جو شرائط درجۂ لزوم میں بیان کیے گئے، ان کو ریاستی اختیار کے عمومی دائرے میں منطبق کرتے ہوئے صواب دیدی قرار دینے کی وجہ مصنف کے نزدیک اتمام حجت کا قانون ہے۔ مشرکین عرب کے لیے چونکہ اسلام قبول کرنا لازم تھا، اس لیے قبول اسلام کے شرائط کے طور پر ان سے نماز اور زکوٰۃ کی عملی پابندی بھی لازماً مطلوب تھی اور ایسا نہ کرنے پر ان کے خلاف قتال، گویا لازم تھا۔ تاہم اس خاص دائرے سے باہر عمومی صورت حال میں مسلمان شہریوں پر ان احکام کی تنفیذ مصنف کے نزدیک حکمت عملی کے تحت صواب دیدی ہے۔

ابو یحییٰ

اللہ تعالیٰ کے لیے 'خدا' کے اسم کا استعمال

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

پچھلے دنوں ایک صاحب ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ گفتگو کے دوران میں انھوں نے یہ بیان کیا کہ میری کتابیں جب وہ بعض لوگوں کو دیتے ہیں تو وہ اس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ان کتابوں میں اللہ تعالیٰ کے لیے 'خدا' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ 'خدا' کا استعمال اس کی توہین کے مترادف ہے، اس لیے وہ میری کتابوں اور تحریروں کو مفید سمجھنے کے باوجود دوسروں تک نہیں پہنچا سکتے۔ یہ صرف ایک ہی واقعہ نہیں ہے، بہت سے لوگ مجھ سے لفظ 'خدا' کے استعمال کے بارے میں ایسی ہی رائے کا اظہار کر چکے ہیں۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ اس اہم مسئلے پر تفصیل سے بات کی جائے۔

قرآن کا فیصلہ

اللہ تعالیٰ کا کیا نام درست ہے اور کیا نہیں، کس نام کو اس کی طرف نسبت دی جا سکتی ہے اور کس کو نہیں، اس کا فیصلہ نزول قرآن کے وقت ہی ہو گیا تھا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ایک نام 'الرحمٰن' بیان ہوا ہے۔ 'الرحمٰن' کا لفظ عربی زبان کا معروف لفظ تھا جس سے مشرکین عرب واقف تھے۔ تاہم ذات باری تعالیٰ کے لیے وہ 'اللہ' کا لفظ استعمال کرتے تھے، جب کہ اللہ تعالیٰ کے نام کے طور پر 'الرحمٰن' کا لفظ زیادہ تر اہل کتاب میں استعمال ہوتا تھا۔ قرآن کریم نے بھی بعض مقامات پر اس نام کو اللہ تعالیٰ کے ذاتی نام کے طور پر استعمال کیا۔ مثلاً سورۂ رحمٰن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”الرحمٰن نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے۔“(۵۵: ۱-۲)

جب قرآن نے لفظ 'الرحمٰن' کو استعمال کیا تو مشرکین عرب، جو مخالفت پر تلے بیٹھے تھے، انھوں نے اس بات کو اچھالنا شروع کر دیا۔ قرآن کریم میں مشرکین کے ردعمل کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

”جب ان سے کہا جاتا ہے کہ الرحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں: الرحمٰن کیا ہے؟ کیا ہم اس چیز کو سجدہ کریں جس کا تم ہمیں حکم دیتے ہو؟ اور یہ چیز ان کی نفرت کو اور بڑھاتی ہے۔“(الفرقان ۲۵: ۶۰)

یہ چونکہ توحید کا مسئلہ تھا، جس کی وضاحت قرآن کا بنیادی موضوع ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ غلط فہمی دور کر دی کہ اللہ کے سوا کسی اور نام سے ذات باری تعالیٰ کو پکارنا غلط ہے۔ فرمایا:

”اے نبی، انھیں بتا دو تم اللہ کہہ کر پکارو یا الرحمٰن کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو، اس کے لیے سب اچھے ہی نام ہیں۔“(بنی اسرائیل ۱۷: ۱۱۰)

یہ آیت ٹھیک اس مسئلے کے بارے میں بھی ایک قطعی فیصلہ دے دیتی ہے جو لفظ 'خدا' کے حوالے سے آج درپیش ہے۔ یہ نص قطعی ہے جو صاف بیان کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو نہ صرف 'الرحمٰن' کہہ کر پکارنا درست ہے، بلکہ ہر وہ اچھا نام جو اللہ تعالیٰ کی ہستی کے لیے کسی زبان، علاقے یا قوم میں رائج ہے، اس نام سے اللہ تعالیٰ کو پکارنا بالکل جائز ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص قوم یا علاقے کے رب نہیں، بلکہ رب العٰلمین ہیں۔ ان کا تصور ہر گروہ اور ہر زمانے میں پایا جاتا رہا ہے۔ لوگوں نے اپنی اپنی زبانوں میں اللہ تعالیٰ کے لیے مختلف الفاظ استعمال کیے ہیں، مگر ان سب ناموں سے مراد ایک ہی ہستی ہوتی ہے، جسے اہل عرب نزول قرآن کے وقت اللہ کہتے تھے۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے زمین کا تصور ہر قوم، گروہ اور علاقے میں پایا جاتا ہے، مگر اہل عرب اسے ارض، انگریز ارتھ اور ہم لوگ زمین کہتے ہیں۔ کیا ان تین مختلف ناموں سے زمین کے تصور میں تبدیلی آ گئی؟ یہی بات اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں واضح کی ہے۔ اب صرف ایک سوال کا جواب باقی ہے کہ کیا ہماری زبان میں 'خدا' کوئی اچھا لفظ ہے یا نہیں؟ اس کا جواب ہمیں لغت میں مل جاتا ہے۔ ”اردو ڈکشنری“ بورڈ کی شائع کردہ اردو زبان کی سب سے بڑی اور مستند لغت میں 'خدا' کے لفظ کے تحت لکھا ہے:

”بندے کے مقابل، خالق کائنات کا ذاتی نام اور خود اس کی ذات جس کے صفاتی نام ننانوے ہیں اور جو اپنی ذات وصفات کے ساتھ ہر جگہ موجود ہے، وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا، وہ یکتا ہے اور اس کا مثل کوئی نہیں۔“(۸/۴۶۰)

کیا اس وضاحت کے بعد لفظ 'خدا' کے استعمال کے بارے میں کوئی شک و شبہ باقی رہ جاتا ہے؟ اردو لغت والوں نے 'خدا' خدا کے یہ معنی گھر بیٹھے تخلیق نہیں کیے ہیں۔ اہل زبان جب کبھی لفظ 'خدا' کو زبان سے ادا کرتے ہیں؛ وہ جب خدا کی قسم کھاتے ہیں؛ وہ جب گواہ بناتے ہیں، ان کے ذہن میں اللہ کے سوا کسی اور کا تصور تک نہیں ہوتا۔ کسی زبان کی اصل سند اس کے اساتذہ کا کلام ہوتا ہے۔ دیکھیے کہ اردو زبان کے ائمہ کس طرح 'خدا' کے لفظ کو اللہ تعالیٰ ہی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ میر کا شعر ہے:

اب تو جاتے ہیں بت کدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

غالب کہتے ہیں:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اقبال کہتے ہیں:

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

دور حاضر کے معروف نعت و ثنا خواں شاعر مظفر وارثی کی حمد کا یہ شعر تو بچے بچے کو یاد ہے:

کوئی تو ہے جو نظام ہستی چلا رہا ہے، وہی خدا ہے

یہ اشعار جب سنے جاتے ہیں تو ذہن میں، سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کا تصور تک نہیں ہوتا۔

انبیا کا طریقہ

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۱۰ اس بحث میں فیصلہ کن ہے، مگر ذرا اور آگے چلیے اور دیکھیے کہ انبیا کا طریقہ کیا تھا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب 'اسرائیل' تھا۔ یہ لفظ دو اجزا سے مرکب ہے: اِسر اور اِیل۔ قدیم عبرانی زبان میں اللہ تعالیٰ کو 'اِیل' کے لفظ سے پکارا جاتا تھا، جب کہ اِسر کے معنی بندے کے ہیں۔ سو ان کے لقب اسرائیل کا مطلب ہوا: 'ایل'، یعنی اللہ کا بندہ۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان عبرانی تھی۔ ۸۶ برس کی عمر میں ان کی دعا کے جواب میں جب اللہ تعالیٰ نے ان کو بیٹا عطا فرمایا تو آپ نے ان کا نام اسمٰعیل رکھا۔ اس نام

کا مطلب ہے کہ 'اِیل'، یعنی اللہ تعالیٰ نے سنا۔

اللہ تعالیٰ نے نہ صرف ان انبیا کے زمانے میں اس بات پر کوئی ممانعت نہیں کی، بلکہ قرآن میں ان دونوں ناموں کو ذکر کر کے قیامت تک اس حقیقت پر مہر صداقت ثبت کر دی کہ کسی زبان میں اللہ تعالیٰ کے لیے جو لفظ بھی رائج ہے، اللہ تعالیٰ کو وہ قبول ہے۔ چاہے وہ عربی لفظ ہو یا عبرانی، ہندی ہو یا یونانی، اردو ہو یا فارسی۔ اللہ کی کوئی زبان نہیں۔ ساری زبانیں اسی کی ہیں۔ اسی سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے لیے عربی کے علاوہ کسی اور زبان کے لفظ کے استعمال پر کوئی اعتراض نہیں ہے، و گرنہ لازماً قرآن ان پیغمبروں کے نام بدل کر استعمال کرتا یا انھی پیغمبروں کے زمانے میں ان کے ناموں کی تصحیح کرا دیتا۔

لفظ 'خدا' کے استعمال کی مبینہ قباحتیں

عام طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ لفظ 'خدا' میں بڑی شرعی قباحتیں ہیں۔ مثلاً یہ غیر اللہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں اس کی جمع بھی استعمال ہوتی ہے۔ یہ فارسی میں بدی کی طاقت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.almawrid.org

آیئے، لفظ 'خدا' پر ان اعتراضات کا بھی جائزہ لے لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ اردو زبان میں لفظ 'خدا' جب تنہا استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد وہی ہستی ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ کہتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر ہم نے اردو زبان میں 'خدا' کے معنی کے تحت بیان کیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ بدی کی طاقت کے لیے فارسی زبان میں لفظ 'اہرمن' استعمال ہوتا ہے، نہ کہ 'خدا' کا لفظ۔ 'خدا' کا لفظ تنہا جب کبھی آتا ہے، اس کے معنی کبھی بدی کے خدا کے نہیں ہوتے۔ تاہم اردو اور فارسی زبان میں لفظ 'خدا' مالک، بادشاہ اور آقا کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس پس منظر میں اردو اور فارسی، دونوں زبانوں میں لفظ 'خدا' کے ساتھ کوئی اور لفظ ملتا ہے اور غیر اللہ کے لیے استعمال ہو جاتا ہے۔ جیسے فارسی میں بدی کی طاقت کو خداے اہرمن کہتے ہیں۔ اسی طرح اردو زبان میں میر تقی میر کو خداے سخن کہا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ 'خدا' کے لفظ کی جمع بھی اردو زبان میں مستعمل ہے۔

مگر کیا ان وجوہات کی بنا پر لفظ 'خدا' کا استعمال غلط ہو گیا؟ ہرگز نہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کے لیے عربی کا ایک ایسا لفظ کثرت سے استعمال ہوا ہے، جس میں نہ صرف یہ ساری مبینہ قباحتیں پائی جاتی ہیں، بلکہ کچھ مزید قباحتیں ہیں، جو لفظ 'خدا' میں نہیں ہیں۔

قرآن میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کو 'رب' کہا گیا ہے۔ قرآن و حدیث میں منقول بے شمار دعائیں اس لفظ سے

شروع ہوتی ہیں، مگر یہ لفظ انسان کے لیے عربی میں عام استعمال ہوتا ہے اور قرآن کریم نے بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً سورۂ یوسف میں ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام سے دو قیدیوں نے اپنے خواب کی تعبیر پوچھی تو انھوں نے تعبیر دیتے وقت ان کے آقا کے لیے جو لفظ کہا، قرآن نے اس کے لیے 'رب' کا لفظ استعمال کیا:

اَمَّآ اَحَدُکُمَا فَیَسْقِیْ رَبَّهٗ خَمْرًا. "تم میں ایک اپنے آقا کو شراب پلائے گا۔"

(۱۲:۴۱)

اسی آیت سے ذرا قبل ہی اس لفظ کی جمع 'ارباب'، اہل مصر کے ان دیوی دیوتاؤں کے لیے استعمال کی گئی، جنھیں اہل مصر پوجتے تھے:

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ.(یوسف ۱۲:۳۹) "کیا بہت سے جدا جدا رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے۔"

جمع کے علاوہ اس لفظ کی مونث بھی عربی میں مستعمل ہے، جب کہ لفظ 'خدا' کم از کم اس عیب سے تو بری ہے۔ ایک بہت مشہور حدیث جسے حدیث جبریل کہا جاتا ہے، اس کے الفاظ ہیں۔

أن تلد الأمة ربتها.(مسلم، رقم ۸) "(قیامت کی ایک نشانی یہ ہے کہ) لونڈی اپنی مالکن کو جنے گی۔"

جب اس سب کے باوجود قرآن نے بلا جھجک اس لفظ کو اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال کیا ہے تو 'خدا' کے لفظ کو اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال کرنے میں کیا چیز مانع ہے۔ یاد رہے کہ موجودہ اردو زبان میں یہ لفظ اب اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہو چکا ہے۔ جسے اس بات میں شبہ ہو، وہ اپنے استاد، دفتر یا دکان کے مالک یا صدر مملکت کو اس لفظ سے پکارے اور دیکھے کہ ارد گرد کے لوگ اس کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔

مسئلہ دعوت دین کا ہے

ہمارے ہاں بغیر کسی معقول اور روشن دلیل کے یہ نقطۂ نظر قائم کر لیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اللہ کے سوا کوئی اور لفظ استعمال کرنا غلط ہے۔ ہمارے نزدیک اس قسم کا نقطۂ نظر اللہ تعالیٰ کو اپنا قومی معبود قرار دینے کے ہم معنی ہے، جس کے نتیجے میں اسلامی دعوت کو زبردست نقصان پہنچے گا۔ اس کے بعد ایک مسلمان جب دعوت دین کے لیے اٹھے گا تو وہ کسی انگریز عیسائی کو یہ بتائے گا کہ تم جس ہستی کو God کہتے ہو، بالکل غلط ہے۔ تمھیں میرے اللہ کی عبادت کرنی چاہیے۔ اسی طرح وہ ایک ہندو سے کہے گا کہ تم ایشور (سنسکرت میں اللہ تعالیٰ کا نام)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

کے ماننے والے ہو، جب کہ تمھیں اللہ کو ماننا چاہیے۔ اس کے نتیجے میں دوسرا فریق یہ سمجھے گا کہ مجھے میرے معبود سے ہٹا کر کسی اور معبود کی طرف لایا جا رہا ہے۔ پھر اس کے دل میں ایک اجنبیت اور وحشت پیدا ہو گی اور عین ممکن ہے کہ یہی اجنبیت قبول حق کی راہ میں رکاوٹ بن جائے۔

یہی سبب ہے کہ انبیا کا طریقہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ وہ کبھی نام پر بحث نہیں کرتے، شرک پر بحث کرتے ہیں۔ ان صفات پر بحث کرتے ہیں جو اللہ سے منسوب کر دی جاتی ہیں۔ آپ قرآن میں کبھی اس گفتگو کو پڑھیے جو انبیا و رسل اور ان کی اقوام کے بیچ میں ہوئی ہے۔ اس میں سارا زور توحید کو منوانے پر ہے۔ قرآن بیان کرتا ہے کہ تمام رسول اپنی قوم کی زبان ہی بولتے تھے (ابراہیم ۱۴: ۴)۔ ان رسولوں کی اقوام اپنی زبان میں یقیناً اللہ تعالیٰ کو کسی نہ کسی نام سے پکارتی ہوں گی۔ وہ رسول بھی اسی نام سے اللہ کو پکارتے تھے، مگر وہ کہتے تھے کہ تم جسے رب العٰلمین مانتے ہو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ تنہا اسی کی عبادت کرو۔

آج ہمارے لیے بھی یہی طریقہ آئیڈیل ہے۔ اور ہم اس طریقے پر تب ہی عمل کر سکتے ہیں جب ہم ظواہر پرستی سے باہر نکل کر یہ جان سکیں کہ اللہ ایک ہے اور سارے اچھے نام اسی کے ہیں۔ پھر یہ ممکن ہو گا کہ ایک امریکی کو ہم یہ بتا سکیں گے کہ تم 'God' کی عبادت کرتے رہو، لیکن اس کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھیراؤ۔ کسی کو اس کا بیٹا اور بیوی نہ قرار دو۔ ایک ہندو کو ہم بتا سکیں گے کہ یہ ٹھیک ہے کہ خالق کائنات 'ایشور' ہی ہے، مگر دیکھو اس کے ساتھ کسی دیوی دیوتا یا اوتار کو معبود نہ مانو۔

اس کے بعد وہ شخص جب اسلام قبول کر کے نماز پڑھے گا، قرآن پڑھے گا، دین کے مقرر کردہ دیگر اعمال ادا کرے گا تو وہاں وہ اللہ ہی کا نام لے گا، مگر یہ حق کسی کو نہیں کہ وہ اس کی زبان بدلوانے کی کوشش کرے۔ اسے اجازت ملنی چاہیے کہ وہ اپنی زبان میں اللہ کو جو چاہے کہہ کر پکارے، کیونکہ سارے اچھے نام اللہ ہی کے لیے ہیں۔ یہ حق اسے اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور کوئی اس سے اس کا یہ حق نہیں چھین سکتا۔

محمد وسیم اختر مفتی

مہاجرین حبشہ

(۱۵)

[''سیر و سوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضرت سویبط بن سعد رضی اللہ عنہ

شجرۂ نسب

حضرت سویبط (شاذ روایت: سلیط) بن سعد کا تعلق قریش کے قبیلے بنو عبدالدار بن قصی سے تھا۔ سوانح نگاروں نے ان کے والد کا نام سعد بن حرملہ (ابن عبد البر)، سعد بن حریملہ یا حرملہ بن مالک (ابن اثیر، ابن حجر) بتایا ہے۔ بانی قبیلہ عبدالدار پہلی اور دوسری صورت میں حضرت سویبط کے چھٹے اور تیسری صورت میں پانچویں جد بنتے ہیں۔ کچھ مؤرخین یہ بھی کہتے ہیں کہ حرملہ کو والد قرار دینے والوں نے اصل میں انھیں ان کے دادا کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ قصی پر حضرت سویبط کا سلسلۂ نسب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرے سے جا ملتا ہے۔ عبدالدار کے بھائی عبد مناف بن قصی آپ کے چوتھے جد تھے۔ بنو خزاعہ کی ہنیدہ بنت خباب حضرت سویبط کی والدہ تھیں۔

قبول دین حق

حضرت سویبط ابتداے اسلام میں ایمان لے آئے۔

ہجرتین

حضرت سویبط صاحب الہجرتین تھے۔ پہلی ہجرت حبشہ کی طرف کی، وہاں سے جلد مکہ لوٹ آئے۔ وہ ان تینتیس اصحاب میں شامل تھے جو مشرکین مکہ کے ایمان لانے کی افواہ سن کر مکہ میں داخل ہوئے۔ پھر انھوں نے یہاں سے مدینہ کو ہجرت ثانیہ کی۔

مدینہ میں آمد اور مواخات

مدینہ میں حضرت سویبط قبا میں حضرت عبداللہ بن سلمہ عجلانی کے مہمان ہوئے۔ حضرت عبیدہ بن حارث، حضرت طفیل بن حارث، حضرت حصین بن حارث، حضرت مسطح بن اثاثہ، حضرت طلیب بن عمیر اور حضرت خباب بن ارت بھی ان کے ساتھ ٹھیرے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین وانصار میں مواخات قائم فرمائی تو بنوزریق کے حضرت عائذ بن ماعص کو حضرت سویبط کا انصاری بھائی قرار دیا۔

غزوۂ بدر

حضرت سویبط بن سعد نے جنگ بدر میں بھرپور حصہ لیا۔

جنگ احد

حضرت سویبط بن سعد نے جنگ احد میں جاں فشانی سے حصہ لیا۔

افراط مزاح

حضرت سویبط خوش طبع تھے۔ حضرت ام سلمہ نے ان کے افراط مزاح کا ایک قصہ بیان کیا ہے: حضرت ابوبکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ایک سال قبل تجارت کے لیے بصریٰ* گئے۔ دو بدری اصحاب حضرت نعیمان بن عمرو اور حضرت سویبط بن سعد ان کے ساتھ تھے۔ زادراہ حضرت نعیمان کے سپرد تھا۔ حضرت سویبط نے حضرت نعیمان سے کھانا مانگا تو انھوں نے حضرت ابوبکر کے آنے تک انتظار کرنے کو کہا، جو

* شام کے خطہ حوران کا ایک قصبہ۔

اس وقت موجود نہ تھے۔ اس اثنا میں حضرت سویبط کو شرارت سوجھی۔ وہ ایک بردہ فروش کے پاس گئے اور کہا: ہمارے پاس نعیمان نامی ایک ہوشیار عربی غلام ہے، دس چھوٹے اونٹوں کے عوض اسے خرید لیجیے، خیال رہے کہ وہ اپنے غلام ہونے کا انکار کرے گا۔ اس کے کہے کی پروا نہ کیجیے گا۔ تاجر نے اونٹ ان کے حوالے کیے اور رسی یا عمامہ لے کر حضرت نعیمان کے پاس آیا۔ وہ کہتے رہے: میں غلام نہیں، آزاد ہوں۔ تاجر نے ایک نہ سنی اور ان کے گلے میں عمامہ باندھ کر لے گیا۔ اسی وقت حضرت ابو بکر آن پہنچے اور اونٹ واپس کر کے حضرت نعیمان کو چھڑایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کو اس قصے کا پتا چلا تو سب مسکرا دیے (ابن ماجہ، رقم ۳۷۱۹۔ احمد، رقم ۲۶۶۸۷۔ مسند اسحٰق بن راہویہ، رقم ۱۸۶۴۔ شرح مشکل الآثار، رقم ۱۶۲۰)۔

طحاوی نے یہ واقعہ برعکس بیان کیا ہے، یعنی ان کے نزدیک حضرت نعیمان نے دل لگی کر کے حضرت سویبط کو غلامی کے لیے پیش کیا۔ ابن اثیر نے بھی اسے درست قرار دیا ہے۔

امام ابوداؤد، امام نسائی، یحییٰ بن معین، ابوحاتم، ابوزرعہ اور ابن حجر نے اس حدیث کے راوی زمعہ بن صالح کو ضعیف قرار دیا ہے۔

المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۹۱۷۶ اور مسند ابوداؤد طیالسی، رقم ۱۷۰۵ میں یہ واقعہ مکمل بیان نہیں ہوا۔

کیا حد سے بڑھا ہوا مذاق کرنا جائز ہے؟

امام طحاوی نے یہ عنوان قائم کر کے اس روایت کو نقل کیا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی، اشکال رکھنے والی ان حل طلب روایات کا بیان، جن میں مزاح کر کے کسی کو خوف زدہ کرنے کا ذکر ہوا ہے، آیا ایسا کرنے والے کا عمل جائز ہے یا اسے اس سے منع کیا جائے گا؟ پھر وہ کہتے ہیں: کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ حضرت نعیمان نے حضرت سویبط سے جو مذاق کیا، چونکہ اس کا ذکر سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام صحابہ ہنس پڑے، اس لیے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ایک مسلمان کا مخول کر کے دوسرے مسلمان کو ڈرانا جائز ہے۔

اس کے بعد انھوں نے حضرت سویبط کے واقعے سے ملتا جلتا ایک دوسرا واقعہ بیان کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علقمہ بن مجزز مدلجی کی قیادت میں ایک سریہ بھیجا۔ راستے میں آپ نے حضرت عبداللہ بن حذافہ کی امارت میں ایک دستے کو الگ ذمہ داری سونپ دی۔ وہ اصحاب بدر میں سے تھے، لیکن ہنسی، دل لگی کا ذوق رکھتے تھے۔ مہم سے واپسی پر لوگوں نے کھانا پکانے کے لیے آگ جلائی تو حضرت عبداللہ بن حذافہ نے ساتھیوں سے پوچھا: کیا میری اطاعت تم پر واجب نہیں؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں ہے۔ تب تو تمھیں میرا ہر

حکم ماننا پڑے گا، اٹھو اور اس آگ میں کود جاؤ۔ کچھ صحابی اٹھے اور آگ میں داخل ہونے لگے تو حضرت عبد اللہ ہنس پڑے اور کہا: رکو رکو، میں تو تم سے مذاق کر رہا تھا۔ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو فرمایا: اب تو تم نے ایسا حکم مان لیا ہے، آیندہ اللہ کی نافرمانی میں دیے ہوئے حکم میں حکمرانوں کی اطاعت نہ کرنا (ابن ماجہ، رقم ۲۸۶۳۔ احمد، رقم ۱۱۶۳۹۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۴۳۹۷۔ مسند ابویعلیٰ، رقم ۱۳۴۹۔ صحیح ابن حبان، رقم ۴۵۵۸)۔

امام طحاوی کہتے ہیں: ان دونوں احادیث میں اس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسرے کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ ان واقعات میں آپ کی طرف سے صریح نہی کا نہ ہونا ایسے ہی ہے، جیسے حضرت جابر بن سمرہ کی اس روایت سے واضح ہوتا ہے: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی مجالس میں سیکڑوں بار شرکت کی ہے۔ صحابہ اشعار پڑھتے اور جاہلیت کے واقعات سناتے۔ آپ سکوت کرتے اور بسا اوقات تبسم بھی فرماتے (ترمذی، رقم ۲۸۵۰۔ احمد، رقم ۲۱۰۱۰۔ صحیح ابن حبان، رقم ۵۷۸۱)۔ آپ انھیں منع نہ فرماتے، اگرچہ ان سنائے جانے والے اعمال جاہلیت کا اسلام میں مباح ہونا لازم نہ تھا۔

حضرت یزید بن سائب کی روایت ان کے پوتے عبد اللہ نے نقل کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی ہنسی مذاق کرتے ہوئے یا سنجیدگی سے اپنے بھائی کا مال و متاع نہ چھین لے۔ اگر کسی نے اپنے ساتھی کا عصا بھی لیا تو اسے لوٹائے گا (ابوداؤد، رقم ۵۰۰۳۔ احمد، رقم ۱۷۹۴۱۔ ترمذی، رقم ۲۱۶۰۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۱۵۴۴)۔ عبد الرحمٰن بن ابو لیلیٰ نے کچھ صحابہ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے: ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محو سفر تھے۔ ایک صحابی سویا ہوا تھا کہ دوسرے صحابی نے اس کی رسی پکڑ کر کھینچی تو وہ گھبرا گیا۔ آپ نے فرمایا: کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ دوسرے مسلمان کو خوف زدہ کرے (ابوداؤد، رقم ۵۰۰۴۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۲۱۱۷۷)۔ یہی روایت مسند احمد میں مختلف طرح بیان ہوئی ہے۔ اس میں سوئے ہوئے صحابی کا ترکش چھپانے کا ذکر ہے۔ جب وہ بیدار ہو کر پریشان ہوا تو دوسرے اصحاب ہنسنے لگے۔ اس اثنا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم آ گئے اور دریافت فرمایا: کس بات پر آپ اتنا ہنس رہے ہیں؟ انھوں نے بتایا: اتنی ہی بات ہوئی ہے کہ ہم نے دل لگی کرنے کے لیے ان کا تیر دان چھپا لیا ہے، یہ پریشان ہوئے تو ہم ہنسنے لگے۔ آپ نے فرمایا: کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ دوسرے مسلمان کو خوف زدہ یا پریشان کرے (رقم ۲۳۰۶۴)۔ طحاوی نے اسی روایت کو اختیار کیا ہے۔

اس بحث کے آخر میں امام طحاوی نے یہ تجزیہ کیا: حضرت سویبط کا واقعہ اور صحابہ کا ترکش چھپانے کا عمل

مماثل ہیں۔اصحاب رسول نے مباح سمجھ کر یہ عمل کیے ہوں گے۔آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صریحاً حرمت کا حکم صادر فرمادیا تو قبل ازیں سمجھی جانے والی اباحت منسوخ ہو گئی (شرح مشکل الآثار ۴/۲۰۴-۳۱۰)۔

عائلی زندگی اور وفات

بدر و احد کے بعد کسی غزوہ یا سریہ میں حضرت سویبط کی شرکت نہیں بتائی گئی۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی زندگی مختصر رہی ہو گی۔بلاذری کہتے ہیں کہ انھوں نے اس وقت وفات پائی جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کے لیے جا رہے تھے۔

حضرت سویبط بن سعد کی اولاد کے بارے میں معلومات نہیں ملتیں۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، جمل من انساب الاشراف (بلاذری)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، Wikipedia۔

حضرت فراس بن نضر رضی اللہ عنہ

حضرت فراس بن نضر ام القریٰ مکہ میں پیدا ہوئے۔حارث بن علقمہ ان کے دادا اور بانی قبیلہ عبدالدار بن قصی چھٹے جد تھے۔ قصی بن کلاب پر ان کا سلسلۂ نسب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرہ سے جا ملتا ہے جو آپ کے پانچویں جد تھے۔عبدالدار کے تین بیٹے عثمان، عبد مناف اور سباق ہوئے۔حضرت فراس عبد مناف کی اولاد میں سے تھے، کلدہ بن عبد مناف ان کے سکڑ دادا تھے۔حضرت مصعب بن عمیر، حضرت ابوالروم بن عمیر کلدہ کے بھائی ہاشم بن عبد مناف کے پوتے اور حضرت جہم بن قیس سکڑ پوتے تھے۔حضرت سویبط بن سعد عبدالدار کے تیسرے بیٹے سباق کی اولاد میں سے تھے۔حضرت فراس کے چچا حضرت نضیر بن حارث مؤلفۃ القلوب میں سے، مخلص مومن تھے۔انھوں نے مدینہ ہجرت کی اور جنگ یرموک میں شہادت پائی۔

بنو تمیم کی زینب بنت نباش حضرت فراس کی والدہ تھیں۔

ابوالحارث حضرت فراس کی کنیت تھی، قبیلے کی نسبت سے قُرَشی، عبدری اور داری کہلاتے ہیں۔

قبول اسلام

ساتویں صدی عیسوی: دوسرے دہے کے آغاز میں مکہ میں اسلام کا آفتاب طلوع ہوا۔ حضرت فراس بن نضر اس کی کرنوں سے مستفید ہونے والے اولیں اہل ایمان میں شامل تھے۔

ہجرت حبشہ

حضرت فراس کا باپ نضر بن حارث حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بد ترین دشمن تھا۔ وہ اہل ایمان کو اذیتیں دینے میں پیش پیش تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ قرآن معاذاللہ پہلی قوموں کی جھوٹی سچی کہانیاں ہیں، اس طرح کا کلام تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت فراس مکہ سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ وہ حبشہ کی طرف ہجرت ثانیہ کرنے والے مہاجرین میں شامل ہوئے۔

حبشہ سے واپسی

حضرت فراس بن نضر جنگ بدر کے بعد، فتح خیبر سے پہلے یا بعد کسی وقت مدینہ لوٹے۔ ابن اسحاق کے بیان کے مطابق وہ حضرت جعفر بن ابو طالب کے قافلۂ رجوع میں شامل نہ تھے۔

غزوات

حضرت فراس کا والد نضر بن حارث جنگ بدر میں کفار کی طرف سے لڑا اور مسلمانوں کی قید میں آیا۔ جیش اسلامی میدان جنگ سے واپسی پر صفرا کے مقام پر پہنچا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اسلام دشمن سرگرمیوں کی بنا پر حضرت علی کو اس کی گردن اڑانے کا حکم دیا۔ تب حضرت فراس سرزمین حبشہ میں تھے۔ حضرت فراس کی مدنی زندگی کے بارے میں معلومات میسر نہیں، اگرچہ صحابہ کی زندگیوں کے بارے میں ترکی کی 'org nurkoy' کے زبیر اگابے کے مرتبہ سلسلۂ مضامین میں بتایا گیا ہے کہ حضرت فراس بن نضر فتح مکہ، غزوۂ حنین، محاصرۂ طائف اور غزوۂ تبوک کے مواقع پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ تھے۔ حجۃ الوداع کے وقت بھی وہ آپ کے ہم سفر رہے۔

خلافت راشدہ

حضرت فراس بن نضر نے حضرت ابو بکر کے عہد خلافت میں مرتدین اور مانعین زکوٰۃ کی سرکوبی میں

حصہ لیا۔ انھوں نے خلیفۂ دوم حضرت عمر کے حکم پر بازنطینی حکومت کے خلاف ہونے والی پہلی جنگ یرموک میں حصہ لیا، جس میں مسلمانوں کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی اور بلاد شام سلطنت اسلامیہ کا حصہ بن گیا۔ حضرت فراس بن نضر نے اس معرکے میں شجاعت کے جوہر دکھانے کے بعد جان کا نذرانہ پیش کیا۔

شہادت

حضرت فراس بن نضر نے ۱۵ھ میں رومی فوج کے خلاف لڑی جانے والی جنگ یرموک میں جام شہادت نوش کیا۔

اولاد

حضرت فراس بن نضر کی کوئی اولاد نہ تھی۔ کچھ لوگوں نے ان کی کنیت ابوالحارث سے حارث نامی بیٹا برآمد کر لیا ہے، حالاں کہ عربوں کے ہاں کنیت اختیار کرنے کے لیے صاحب اولاد ہونا ضروری نہیں۔ بعض اوقات غیر انسان سے خاص تعلق کو کنیت کی بنیاد بنا لیا جاتا ہے۔ جیسے بلی سے ابوہریرہ، اونٹنی کے بچے سے ابوبکر، جسم خاک آلود ہونے پر ابوتراب، جبل قبیس کی نسبت سے ابوقبیس اور پیدایشی تل ہونے کی وجہ سے ابوشامہ کنیت رکھ لی گئی۔ حضرت عائشہ نے اپنے لیے کوئی کنیت ہونے کی خواہش ظاہر کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم اپنے بھانجے عبداللہ بن زبیر کے نام پر اپنی کنیت ام عبداللہ رکھ لو (احمد، رقم ۲۵۱۸۱۔ مصنف عبدالرزاق، رقم ۱۹۸۵۸۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۸۵۶۸۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۹۳۳۵)۔ کنیت مدح و مذمت کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے، جس طرح مدح پر مبنی کنیت ابوالحکم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجہل میں تبدیل کر کے دائمی مذمت بنا دیا۔

روایت حدیث

حضرت فراس بن نضر سے کوئی روایت مروی نہیں۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، جمل من انساب الاشراف (بلاذری)، جمہرۃ انساب العرب (ابن حزم)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، Wikipedia۔

محمد ذکوان ندوی

دین داری یا مسلک پرستی

۲۴؍ جون ۲۰۲۲ء کا واقعہ ہے۔ ہمارے محلے کے ایک عزیز کے ہاں عقد نکاح کا پروگرام تھا۔ اِس موقع پر اُن کے بہت سے اعزہ یہاں آئے ہوئے تھے۔ اِن میں ایک ’’مفتی صاحب‘‘ بھی تھے۔ وہ اپنے علاقے میں سنی مسلک کے ایک غالی نمایندہ مانے جاتے ہیں۔ ملاقات ہوئی تو میں نے بڑھ کر سلام کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ ہمارے رشتے کے ایک عزیز ہیں۔ چنانچہ اُنھیں گھر پر مدعو کیا۔

اِس دوران میں دل سوزی اور حکمت کے ساتھ تبادلۂ خیال جاری رہا۔ میں نے ایک بات یہ کہی کہ ہم مسلکی مسلمان ہیں، مگر ہم محمدی مسلمان نہیں۔ انھوں نے اِس کا مطلب پوچھا تو میں نے کہا: اسوۂ رسول کے مطابق، محمدی مسلمان سے مراد اللہ سے ڈرنے والا اور تعصبات سے بلند ہو کر عملاً انسانوں کے ساتھ حسن اخلاق کا معاملہ کرنے والا آدمی ہے۔ انھوں نے اِس بات سے پوری طرح اتفاق کیا اور کہا: اگر ہم محمدی بن سکیں، پھر تو سارے جھگڑے ہی ختم ہو جائیں گے۔

اِس دوران میں نماز عشا کا وقت ہو گیا۔ میں نے اُن کے ذہن کو دیکھتے ہوئے عمداً نماز کے لیے اُن سے نہیں کہا، مگر انھوں نے خود ہی فرمایا: ہم بھی آپ کے ساتھ نماز کے لیے چلیں گے۔ میں نے کہا: ضرور۔ مسجد پہنچے تو جماعت کا وقت ہو رہا تھا۔ میں نے اُنھی سے نماز پڑھانے کی درخواست کی۔ چنانچہ وہ مقتدیوں کی طرف رخ کر کے بیٹھ گئے اور ’حیّ علی الصلوٰۃ‘ پر کھڑے ہو کر نماز کی امامت فرمائی۔ نماز کے بعد میں نے کہا: آج جمعہ کا مبارک دن ہے۔ آپ نعت پاک کے چند اشعار پڑھ دیں تو ہمارے دلوں میں بھی ایمان اور محبت رسول کی

حرارت پیدا ہو جائے۔ وہ بہت خوش ہوئے اور چند اشعار پیش فرمائے۔ پھر میں نے صلوٰۃ و سلام کی گزارش کرتے ہوئے کہا: اگر آپ سلام پڑھ دیں تو آج جمعہ کے اِس دن کا حسن خاتمہ صلوٰۃ و سلام پر ہو گا۔ چنانچہ انھوں نے سلام پڑھا اور ہم لوگ کھڑے ہو کر اُن کے ساتھ صلوٰۃ و سلام کی اِس محفل میں شریک ہوئے۔

وہ بہت خوش ہوئے اور سلام کے بعد انتہائی پر جوش انداز میں لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: آپ حضرات کے متعلق ہم پہلے یہ سمجھتے تھے کہ آپ کو حضور سے محبت نہیں، مگر آج ہماری غلط فہمی دور ہو گئی۔ پھر انھوں نے کہا: آج ضرورت ہے کہ ہر جگہ ایسا ماحول بنایا جائے اور ایسے امام تیار کیے جائیں جو مسلک پرستی سے بلند ہو کر لوگوں کو اللہ اور رسول کی طرف بلائیں تاکہ امت کا انتشار ختم ہو اور ہم سب مل کر انسانوں کی بھلائی اور اُن کی فلاح کا کام موثر انداز میں کر سکیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اِس تجربے سے متاثر ہو کر موصوف اب مسلکی تشدد کے بجائے اعتدال اور توسط کے داعی بن گئے ہیں۔

اِس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر ہم محبت اور حکمت کے ساتھ دعوت الی اللہ کا کام کریں تو ہمارے درمیان اِس طرح کے بہت سے مسائل کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ اِس کے لیے ضروری ہے کہ ہم بے روح اور مبنی بر جمود 'مذہبیت' اور متشددانہ مسلک پرستی کے بجائے خدا کے سچے دین کو اختیار کریں۔ یہی سچا دین ہمارے لیے مطلوب صراط مستقیم اور رسول خدا کا اصل مسلک قرار پائے گا۔

[لکھنؤ، ۱۰ ستمبر ۲۰۲۲ء]

www.javedahmadghamidi.com

ڈاکٹر عرفان شہزاد

بچوں کے ادب میں تشدد پسندی اور سفاکیت

جانے انجانے میں بچوں کے ادب میں سفاکیت اور تشدد پسندی کے عناصر کا در آنا ہماری خاص توجہ کا متقاضی ہے۔

ہمٹی ڈمٹی کی بے بسی، اس کا دیوار سے گرنا اور ٹوٹ کر جڑ نہ سکنا، ایک المیہ ہے، نہ کہ طربیہ کہ جس سے لطف کشید کیا جائے۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی شہرۂ آفاق نظموں کے مجموعے ''جھولنے'' کی نظم:

چیونٹی کا سر پھوڑ دو
چلاّئے تو چھوڑ دو
سانپ کی دم مروڑ دو
چلاّئے تو چھوڑ دو

بے حسی اور سفاکیت کی تعلیم دیتی ہے، جو بچپن میں ذہنوں میں جگہ بنا لیتی ہے۔ اونٹ اور گیدڑ کی کہانی میں اونٹ کا گیدڑ سے بدلہ لینے کے لیے اسے دریا میں ڈبو کر مار ڈالنا، برائی کے بدلے میں اس سے زیادہ برائی کا بیانیہ ہے۔ روبن ہڈ کی کہانی میں امیروں سے مال لوٹ کر غریبوں میں تقسیم کرنے کو ہیروازم سمجھنا نیک نیتی کی بنیاد پر قانون شکنی کے جواز کی تعلیم دیتا ہے۔ دولت مند سے محض اس کی دولت مندی کی وجہ سے نفرت اور پھر اس کی دولت کو قانونی اور غیر قانونی ہتھکنڈوں سے چھین لینے کی خواہش کے پیچھے اسی قسم کے خیالات کار فرما ہوتے ہیں۔ ون مین آرمی جیسی فلموں سے طاقت کے بل پر مسائل کو حل کرنے کی خُو پیدا ہوتی ہے۔

بچوں کے ادب میں یہ منفی خیالات بہت غیر محسوس انداز سے بچوں کے ذہن کا حصہ بنتے اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بد نما رویوں کو پھیلاتے ہیں۔ مخبوط الحواس افراد کو چھیڑنا، سوئے ہوئے کتے کو پتھر مارنا،

پنجرے میں قید جانوروں اور پرندوں کو ستانا، کیڑے مکوڑوں کو بلاوجہ کچل دینا، لوگوں پر دھونس جما کر طاقت اور اختیار کے سوءِ استعمال کا لطف اٹھانا، ماحول کے اثر کے علاوہ ایسی تعلیمات سے جواز بھی پاتے ہیں۔

بچوں کے ادب میں منفی رویوں کی موجودگی کی نشان دہی اور اس کی روک تھام کے لیے سنجیدہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔

اسکولوں میں تفریح کے اوقات کی بندش کی سزا

اسکولوں میں جب سے طلبا کو جسمانی سزا دینے پر پابندی عائد کی گئی ہے، ان کی تنبیہ و تادیب کے لیے متبادل طریقے اختیار کیے جا رہے ہیں، جن میں کچھ معقول اور مناسب ہیں، لیکن کچھ جسمانی سزا سے بھی زیادہ مضر نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک طلبا کی تفریح کے اوقات (Break Time) کی بندش ہے۔

تفریح کا مختصر دورانیہ بچوں کا محبوب ترین وقت ہوتا ہے۔ پے در پے اسباق کی تدریس سے تھکے ہوئے اذہان کے لیے نصف یا پون گھنٹے کی تفریح بڑی غنیمت ہوتی ہے، جس میں وہ اپنی تھکن بھی اتار لیتے اور آنے والے اسباق کے لیے کچھ تازہ دم بھی ہو جاتے ہیں۔ اس دوران میں وہ دیگر طلبا سے تعامل، مسابقت، تصادم، دوستی اور دشمنی وغیرہ کے غیر نصابی اسباق بھی سیکھتے ہیں، جو ان کی عملی زندگی کے لیے ضروری ہیں، نیز ان کی جسمانی توانائی بھی درست مصرف میں خرچ ہوتی ہے۔

اس قیمتی وقت کی بطور سزا بندش ناقابل تلافی نقصان ہے، جو طالب علم کی کسی بھی کوتاہی یا قصور کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ خصوصاً کم سن بچوں کے لیے تو یہ سزا انھیں دنیا کی تمام نعمتوں سے محروم کر دینے کے مترادف ہے۔

کھیل بچوں کے لیے عبادت کی طرح ہے اور کسی کو حق نہیں کہ بچے کو اس کی عبادت سے روک دے۔

تفریح کی بندش سے بچے میں جو پژمردگی پیدا ہوتی ہے، وہ تفریح کے بعد کے اسباق کے لیے اس کی ذہنی حاضری اور سیکھنے کی سکت کو بھی شدید متاثر کر دیتی ہے۔ اگر کسی تعلیمی کوتاہی کی بنا پر بچے کو یہ سزا دی گئی ہے تو یہ اس کے مزید تعلیمی نقصان کا باعث بنتی ہے۔

تادیب و تنبیہ کے لیے کوئی بھی معقول اور موثر طریقہ سوچا جا سکتا ہے، مگر تفریح کے اوقات کی بندش کسی صورت قبول نہیں کی جا سکتی۔

---

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

علیزے نجف

محمد حسن الیاس سے ایک انٹرویو

[محمد حسن الیاس صاحب جناب جاوید احمد غامدی کے تحقیقی معاون ہیں۔ اِس کے ساتھ وہ "غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، امریکا" کے ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ کمیونیکیشن کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔ حال ہی میں انڈیا کی ایک ویب سائٹ "اشتراک ڈاٹ کام" (ishtiraak.com) نے اُن کا انٹرویو شائع کیا ہے۔ انٹرویو نگار علیزے نجف ہیں۔ یہ انٹرویو مذکورہ ویب سائٹ کے شکریے کے ساتھ شامل اشاعت ہے۔ ادارہ]

www.al-mawrid.org
www.javedahmedghamidi.com

علیزے نجف: اس انٹرویو کا آغاز میں آپ کے بنیادی تعارف سے کرنا چاہوں گی، آپ ہمیں خود سے اور اپنے خاندان سے متعارف کرائیں اور یہ بھی بتائیں کہ آپ کا تعلق کس خطے سے ہے اور اس وقت آپ کہاں مقیم ہیں، غامدی صاحب سے کیا تعلق ہے؟

محمد حسن الیاس: میں ۱۹۸۸ء میں کراچی میں پیدا ہوا۔ میٹرک تک تعلیم کراچی ہی سے حاصل کی۔ کالج کی تعلیم اسلام آباد میں ہوئی۔ دین کا عالم بننے کا شوق تھا۔ چنانچہ اِس کے بعد مدرسے میں داخل ہو گیا۔ جامعہ الرشید کراچی میں چار سال اور پھر اسلام آباد میں جامعہ فریدیہ اور جامعہ محمدیہ میں مزید دو سال درس نظامی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد استاذ مکرم جناب جاوید احمد غامدی کے پاس ملائشیا چلا گیا۔ جہاں جامعہ مدینۃ العالمیہ میں مزید چار سال عربی ادب میں آنرز کیا، کچھ عرصہ اِسی جامعہ میں پڑھایا بھی، اِس کے بعد ملائشیا کی جامعہ مارا سے ماسٹرز کا مقالہ لکھنے کا آغاز کیا۔ ۹ سال ملائشیا میں قیام کے بعد استاذ مکرم ہی کے ہم راہ ۲۰۱۹ء میں امریکا منتقل ہو گیا۔ استاذ مکرم جناب جاوید احمد غامدی صاحب سے پندرہ برس سے زائد علمی استفادے کا تعلق ہے۔ گذشتہ ۱۰ سال

سے استاذ مکرم کے تحقیقی معاون اور خادم ہونے کے ساتھ ساتھ پہلے المورد عالمی اور اب غامدی سینٹر، امریکا میں شعبۂ علم و تحقیق کی ذمہ داری ہے، ساتھ ساتھ مختلف تحقیقی اور علمی پروجیکٹس میں مصروف عمل ہوں۔ رشتے میں غامدی صاحب سسر بھی ہیں۔ ۲۰۱۴ء میں یہ تعلق قائم ہوا۔

خاندانی پس منظر یہ ہے کہ ہمارے والد کا تعلق پاکستان کے شمال مغربی صوبہ کے پہاڑی علاقے ہزارہ سے ہے۔ داداجان مولانا اسحاق علوی نے ۱۹۴۰ء میں دارالعلوم دیوبند سے درس نظامی کی تکمیل کی، اُن کی فراغت کی سند پر اُن کے اساتذہ میں مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا محمد احمد مدنی، مولانا عبدالحق سرحدی اور مولانا اعزاز علی صاحب کے نام دیکھے۔ داداجان کے والد مولانا اسمٰعیل بھی ہندوستان جامعہ رحیمیہ کے فاضل اور آگرہ میں مقیم رہے، پھر سہارنپور میں تعلیم وتدریس میں مصروف ہو گئے۔ دونوں بزرگوں کا تصوف اور عربی زبان سے گہرا تعلق رہا۔ داداجان دیوبند سے پاکستان تشریف لے آئے اور پوری زندگی یہیں تعلیم و تعلم میں مصروف رہے۔ اُنھوں نے طویل عمر پائی۔ بچپن میں اُن کی صحبت میں کچھ وقت بھی گزرا۔ گاؤں میں جو ادارہ آپ کے والد گرامی نے قائم کیا تھا، اُس میں نہ صرف ہندوستان، بلکہ مشرق وسطیٰ، روس، ترکی اور دیگر ممالک کے طلبا بھی فنون کی تعلیم لینے آتے اور کئی برس اِس گاؤں میں گزارتے تھے۔

والدہ محترمہ مولانا یوسف بنوری علیہ الرحمہ کی نواسی اور مولانا محمد طاسین صاحب کی صاحب زادی ہیں۔ مولانا یوسف بنوری علامہ انور شاہ صاحب کشمیری کے شاگرد رشید تھے۔ دارالعلوم دیوبند اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے فارغ التحصیل ہو کر آپ پاکستان تشریف لے آئے، جہاں ۱۹۵۴ء میں دینی تعلیم کے اختصاص کا ایک ادارہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ (بنوری ٹاؤن) کے نام سے شروع کیا۔ آج دیوبندی نقطۂ نظر کا یہ پاکستان کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ آپ تحریک ختم نبوت اور وفاق المدارس کے صدر بھی تھے، تصنیفی و تعلیمی خدمات میں ''معارف السنن'' آپ کے علمی مرتبے کا شاہ کار ہے۔ ناناجان مولانا محمد طاسین بھی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے فارغ التحصیل اور مولانا بنوری کے اجل شاگرد ہونے کے ساتھ ساتھ دیوبند کی علمی روایت میں کھڑے اجتہادی بصیرت رکھنے والے ایک بلند پایہ محقق اور فاضل اسکالر تھے، آپ کا زیادہ تر کام اسلام اور معیشت پر رہے۔ اِس موضوع کی متعدد کتب آپ کی جانب سے سامنے آئیں۔ بچپن میں ناناجان کی صحبت میں بھی میرا وقت گزرا۔ لہٰذا دونوں جانب سے خاندان ایک دینی اور علمی پس منظر رکھتا ہے اور اِس خانوادے کے بیش تر لوگ آج بھی اِسی خدمت میں مصروف ہیں۔

علیزے نجف: آپ کا بنیادی تعلق پاکستان سے ہے، آپ کی ابتدائی عمر کا بیش تر حصہ وہیں پر ہی گزرا، پھر اس کے بعد آپ ملائشیا اور دیگر مغربی ممالک میں بھی رہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا مشرقی ممالک کے بچوں کو ملنے والا ماحول مغربی ممالک کے بچوں کو ملنے والے ماحول سے بہتر ہوتا ہے؟ اس ضمن میں مغربی ممالک کی وہ کون سی اعلیٰ اقدار ہیں جو مشرقی ممالک میں نہیں پائی جاتیں؟

محمد حسن الیاس: مجھے جس حد تک اِن مختلف تہذیبوں کو دیکھنے کا موقع ملا ہے، اِس میں شبہ نہیں کہ اِس وقت پاکستان شدید اخلاقی انحطاط اور تہذیبی بحران میں مبتلا ہے۔ اِس خطے میں گذشتہ دو سو سال تخریب، تنازعات، ہیجان اور conflict کے ہیں۔ اِس کے نتیجے میں ہمارا سماجی دھارا بکھر کر رہ گیا ہے۔ عظمت رفتہ کی بازیافت، استخلاص وطن کی تحریکیں، مذہبی ریاست کے بیانیے، سیاسی عدم استحکام، سول ملٹری کشمکش، معاشی تنگی، سیاسی انتشار اور خطے کی مجموعی صورت حال، اِن سب عناصر نے قوم کو نفسیاتی ابال، ہیجان اور برانگیختگی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اِس وجہ سے ہمارا علمی ورثہ، تہذیبی شناخت، زبان و ادب، آرٹ اور کلچر، زندگی، اُس کی حقیقتیں، اخلاقی اقدار و روایات اور تعلیم و تربیت، قومی دل چسپی کے موضوعات نہیں رہے۔ افراتفری کے ماحول میں سوچیں محدود، مقاصد مادی اور اہداف کمرشل ہو گئے ہیں۔ جن حلقوں نے قوم کی تعلیم اور تربیت کرنی تھی، وہی ایک حد تک اِن کے خاتمے کا سبب ہیں۔ یہی معاملہ ہمارے تعلیمی نظام کا ہے، جس کا نصب العین ایک باشعور انسان بنانا، جو اپنی بنیادوں سے واقف ہو، جس کا کوئی مقصد حیات ہو، جو قانون پسند ہو، جس کا کوئی world view ہو، یہ نہیں ہے، چنانچہ اِس ماحول میں اخلاقی اقدار کا نام لینے والا اِس معاشرے میں ناکامی کی علامت بن جاتا ہے۔ پاکستانی معاشرے کے ہر ہر شعبے پر آپ کو اِس کے اثرات نظر آتے ہیں۔ دوا میں ملاوٹ سے لے کر غیبت کی قومی عادت تک، اِس میں شبہ نہیں کہ پاکستان ایک بیمار معاشرے کی علامت ہے۔ اِس کے برعکس ملائشیا میں بہت مختلف صورت حال ہے۔ پوری قوم ایک رخ پر محنت کرتی نظر آتی ہے۔ اسلام کی اخلاقی تعلیمات اُن کے ہاں تہذیبی سطح پر اتنی گہری جڑیں رکھتی ہیں کہ اخلاقیات اب کلچر کا حصہ ہیں۔ شائستگی، تحمل، قانون کی پابندی، سلام میں پہل، قطار بنانا، صفائی، ادب و احترام اور دیگر اخلاقی اقدار وجودی حقیقت کے طور پر قومی رویے میں پیوست نظر آتی ہیں۔ اِس کی بنیادی وجہ اُن کے ہاں اِسی انتشار سے دوری، سیاسی استحکام اور اہل دانش اور لیڈر شپ کا تعلیم کو اہمیت دے کر قوم کا ایک رخ متعین کرنا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ پوری قوم ایک ہی مذہبی تعبیر رکھتی ہے، اِسی طرح وہاں بادشاہت ہے جس نے اِس قوم کی وحدت میں کردار ادا کیا ہے، لیکن سماج اگر پہلے سے اِن

اخلاقی اقدار سے جڑا ہوا نہ ہو تو کوئی ایک پہلو اُسے اِس سطح تک بلند نہیں کر سکتا۔

تیسرا امریکا ہے۔ یہ معاشرہ انسانی تمدن کے ارتقا کا ایک معمل ہے۔ جمہوریت، بنیادی انسانی حقوق، قانون کی حکمرانی اور حق خود ارادی۔ جان لاک کے روشن خیالی کے فلسفہ نے اِن اقدار کو ایک طرز حیات بنانے میں مدد کی۔ یہی آدرش اُن کے قومی میثاق پر اثر انداز ہوئے۔ شخصی آزادی اور حریت فکر، یہ نظریات اِس سرزمین کی دستوری روایت کا جزو لاینفک ہیں۔ کسی بھی سماج کو آگے بڑھانے میں یہی دو پہلو سب سے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ امریکی معاشرہ اگرچہ اپنی بنت میں گہری مذہبیت رکھتا ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ سماجی علوم کی تعلیم و ترویج نے معاشرے کے ہر ہر شعبے پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ معاشرہ آج بھی مسیحی اخلاقی اقدار میں گندھا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنی جغرافیائی حدود سے باہر کی سماجی اخلاقیات سپر پاور کی نظر میں وہ نہیں ہوتیں جو اپنے گھر میں ہوتی ہیں، اِسی طرح سے حفظ فروج اور حفظ مراتب میں بے محابا آزادی بھی لبرل ازم اور پوسٹ ماڈرن ازم کے غیر اخلاقی کنٹری بیوشن ہیں، لیکن بنیادی اخلاقی اقدار، شخصی احترام، ناپ تول کی پابندی، قانون کی بالادستی، سچائی کی قدر، دوسروں کے حقوق کا احترام اور تحفظ، حقیقت یہی ہے کہ ہم اِن سب میں اُن سے صدیوں پیچھے ہیں۔

علیزے نجف: آپ نے اپنے تعلیمی سفر کا آغاز کہاں سے کیا اور کن کن اداروں سے آپ نے علم کا فیض حاصل کیا، آپ کا یہ تعلیمی سفر بطور دستاویز کہاں تک رہا اور اس سفر کو آپ نے کس طرح طے کیا؟

محمد حسن الیاس: تعلیم تو میں نے مروج اسکول، کالج، مدرسوں اور یونیورسٹیز میں حاصل کی۔ کراچی میں آغا خان اسکولنگ سسٹم کا ایک تعلیمی نیٹ ورک ہے۔ میٹرک تک وہاں پڑھا۔ اِس کے بعد کمپیوٹر سائنسز کی تعلیم حاصل کی اور اسلام آباد OPF کالج سے ICS کیا۔ یہ سب اگرچہ مدرسے میں جانے کی آرزو میں والد صاحب کی ایما پر ہوا۔ مدرسے میں تعلیم کا آغاز جامعہ الرشید سے کیا۔ دیوبندی روایت کا یہ بڑا ادارہ ہے۔ پھر اپنے خیالات کے ارتقا کے باعث چند اور اداروں میں پڑھتا رہا۔ اِسی طرح سے ملائشیا سے استاذ مکرم کی خواہش پر ایک جدید عالمی یونیورسٹی جامعہ مدینۃ العالمیہ سے چار سال دوبارہ عربی ادب میں آنرز کی تعلیم حاصل کی۔ اِس وقت ماسٹرز کے مقالے کا آخری چیپٹر زیر تصنیف ہے۔ لیکن آپ کے اصل سوال کا جواب یہ ہے کہ حقیقی تعلیم میں نے اِن سب اداروں سے نکل کر اپنے استاذ کی خدمت میں آکر حاصل کی۔

تعلیمی ادارے آپ کو بنیادی skills اور علم کی تاریخ کی ایک جھلک دکھاتے ہیں۔ حقیقی علم اُس وقت حاصل

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ہوتا ہے کہ جب آپ کسی موضوع پر assignment base مطالعہ کرتے ہیں۔ اِس میں صحبت اصل ہے۔ جو کسی اہل علم کے زیر سایہ ہی ممکن ہے۔ وہ استدلال کی بنیادیں سمجھاتا ہے، معلومات کی تنقیح سکھاتا ہے، تجزیہ کے مراحل بتاتا ہے، اصولوں کے اطلاق میں تسلسل پیدا کرتا ہے۔ یوں شب و روز آپ اُس کی تحقیقی روش کا مشاہدہ کرتے ہیں، تب جا کر کچھ بنیادی علم حاصل ہوتا ہے۔ میں خود کو اِس راہ کا بالکل ابتدائی مسافر ہی سمجھتا ہوں، تاہم جو دو لفظ سیکھے ہیں، وہ استاذ کی صحبت میں رہ کر عملی assignment حل کر کے ہی سیکھے ہیں۔

علیزے نجف: آپ ایک مذہبی اسکالر ہیں، آپ کی تعلیم کا موضوع مذہب رہا ہے، آپ نے پاکستان کے علاوہ ملائشیا میں بھی تعلیم حاصل کی ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ ہند و پاک کے دینی اداروں کے تعلیمی نصاب اور عرب ممالک کے تعلیمی نصاب میں آپ کیا واضح فرق محسوس کرتے ہیں اور کیا وجہ ہے کہ ہند و پاک کے بیش تر تعلیمی ادارے عصری تقاضوں کے مد نظر نصاب پہ نظر ثانی کرنے سے گریزاں ہیں، اس کی وجہ سے ملت اسلامیہ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔ مدارس کے طلبا عصری شعبوں میں بنا اضافی جد و جہد کے آگے بڑھ نہیں سکتے، کیونکہ دونوں کا نصاب کافی حد تک متضاد ہے، اس عدم توازن کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

محمد حسن الیاس: اِس سوال کو میں تین پہلوؤں سے دیکھتا ہوں: ایک پہلو ہمہ گیر ہے۔ وہ عرب و عجم سب پر محیط ہے۔ وہ ہے تفقہ فی الدین کی روایت سے دور ہو جانا۔ مسلمانوں کی علمی تاریخ کی ابتدائی صدیاں بہت روشن اور زندہ نظر آتی ہیں۔ اُن میں مسلکی اور گروہی پابندیوں سے آزاد ہو کر غور و فکر کی رمق نظر آتی ہے۔ رفتہ رفتہ ہماری امت اِس منہاج سے دور ہو گئی۔ جس کا نتیجہ گروہوں کی عصبیت اور مسلکی شناخت کو ترجیح دینے کی صورت میں نمودار ہوا۔ مسالک کے بڑے لوگوں کے ساتھ ہیرو شپ کا تصور لاحق ہو گیا، لہٰذا علم شخصیات کی تقلید میں محصور ہو ا اور از سر نو تنقید و تحقیق، براہ راست غور و فکر اور قائم شدہ تصورات کی تنقیح کا علم کافی حد تک رک گیا، چنانچہ دین کی صوفیانہ تعبیر ہو، سلفی یا فقہی تعبیر ہو، اِن سب میں اللہ کی کتاب اصل کے مقام پر نہیں کھڑی۔ تصوف میں اصل ''مشاہدہ''، سلفی تعبیر میں اصل ''روایت'' اور فقہی تعبیر ''اجماع'' پر کھڑی ہو گئی۔ غور کیجیے تو یہ تینوں منہاج انسانی ہیں۔ خدا کے دین نے اگر قیامت تک relevant رہنا ہے تو خدا کے کلام کے علاوہ کسی چیز میں یہ صلاحیت نہیں، لیکن ہمارے علم نے اللہ کی کتاب کو یہ اہمیت نہیں دی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے علم کا سارا زور اپنی تعبیر منوانے پر ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اِن تعبیرات سے پیدا ہونے والی دینی

فکر عصر حاضر سے اپنی مطابقت نہیں پیدا کر پاتی اور اُسے محض روایت کے زور پر منوانا چاہتی ہے۔

دوسرا پہلو اطلاقی ہے کہ علم کی تحصیل کیسے ہو؟ برصغیر کے دینی مزاج میں تحفظ کی نفسیات ہے۔ یہ نفسیات بھی اگرچہ اپنا ایک فکری پس منظر رکھتی ہے کہ جب انگریزوں کے تسلط کے بعد یہاں کی مذہبی قیادت نے تعلیمی نظام کے مقابل میں اپنی میراث کو محفوظ کر کے آگے منتقل کرنے کی حکمت عملی اپنائی تو اِس کا ناگزیر تقاضا تھا کہ رجعت پسند ہو اجائے، علمی ماحول ماضی کے زیادہ قریب ہو اور اِس فکری ورثے کے تحفظ اور اُس میں ترمیم و اضافے اور ردوبدل سے دور رہا جائے، کیونکہ یہ راستہ ایک بار اگر کھل گیا تو رکنے والا نہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود اپنی روایت کے اندر جو وسعت اپنے تشکیلی دور میں نظر آتی ہے، اُس کو بھی گوارا نہیں کیا گیا۔ دوسری جانب عالم عرب کی جامعات میں نصابات کی از سر نو تدوین کے جو افادات سامنے آرہے تھے، اُن سے بھی نظریں چرائی گئیں۔ خود برصغیر کے بڑے علما اِس نقصان کا اندیشہ محسوس کر رہے تھے۔ آپ ابوالکلام آزاد کا لکھنؤ تعلیمی کمیٹی سے خطاب پڑھیں۔ اُنھوں نے درس نظامی کے نصاب کے حوالے سے علما کو یہی توجہ دلائی ہے۔ ایک خاص عہد کی بطلیموسی منطق کے زیر اثر لکھی جانے والی کتابیں نہ صرف یہ کہ فنون کا ذوق پیدا کرنے میں مزاحم ہیں، بلکہ موجودہ دور کے محاورہ اور اسالیب بیان سے بھی کوسوں دور ہیں۔ ابوالکلام کے الفاظ میں بادام کا چھلکا اتارنے میں طالب علم کو اتنا نڈھال کر دیا جاتا کہ وہ اُس کا ذائقہ چکھنے کے ذوق ہی سے محروم ہو جاتا ہے۔ خود مولانا یوسف صاحب بنوری علیہ الرحمہ نے بڑی مشقت سے نحو کی ایک کتاب ''شرح ابن عقیل'' نصاب میں شامل کرائی۔ یہ بات درست ہے کہ ان مشکل کلاسیکی انداز کی کتابوں کو پڑھ کر دماغ direct method کے ذریعے سے عبارت اور تالیف جملہ کی نزاکتوں کو سمجھنے کی training پالیتا ہے، لیکن یہ علوم کی تحصیل کا فطری ذوق پیدا نہیں کرتیں اور انسان انھی کو علم سمجھ لیتا ہے۔ اِسی طرح یہ بھی واقعہ ہے کہ درس نظامی کا نصاب ایک خاص عہد کی عدالتی اور قانونی ضروریات کو پورا کرنے کی غرض سے بنایا گیا ہے۔ اگر آپ آج کی جدید جامعات کے نصابات ہی سے اِس کا تقابل کر لیں تو یہ واقعہ ہے کہ خود علما یہ ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ اِس میں بڑی تبدیلیوں کی گنجایش ہے۔

تیسرا پہلو انسانی ہے۔ اِس دنیا کی تخلیقی اسکیم میں خدا تعالیٰ نے ہر انسان کو متنوع صلاحیتیں دے کر پیدا کیا ہے۔ دین کا عالم بننے کی صلاحیت بھی انسان لے کر پیدا ہوتا ہے۔ پھر دین کا علم ایک سائنس کا اختصاص ہے۔ اُسی طرح جیسے طب اور ہندسہ کا علم ہے۔ کس انسان میں دین کا عالم بننے کی صلاحیت ہے؟ یہ فیصلہ شعور کی سطح پر

جا کر اُس وقت ہوتا ہے جب انسان کو اپنی شخصیت اور زمانے کی پہچان ہو جائے۔ یہ اطلاع بارہ سال کی بنیادی تعلیم کے بعد ہوتی ہے۔ جب آپ کو زبان کا بنیادی علم حاصل ہوتا ہے، اِسی کے ذریعے سے علوم کا تعارف پیدا ہوتا ہے، تب جا کر آپ کی ذات میں موجود صلاحیت اور فطری انسیت ایک شعوری انتخاب میں ڈھلتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ اِسی کے بعد طب اور دیگر مہارتوں کا اختصاص کیا جاتا ہے، جب کہ مذہبی مدارس میں پانچ سال کے بچے کو آپ اپنی خواہش سے عالم بنانا چاہتے ہیں، یہ ایسے ہی ہے جیسے آپ ایک طفل کے ہاتھ میں نشتر پکڑا کر اسے سرجن بنانے کا آغاز کر دیں۔ ہمارے ہاں یہی ہوا ہے۔ لہٰذا اُس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ انسان جسے اللہ نے ہنر مند پیدا کیا تھا، وہ شاعر تھا، حکیم تھا، مہندس تھا، آپ نے اُسے دین کا عالم بنا دیا۔ اِس سے خود دین کے علم کا جو نقصان ہوا، علما اور معاشرے میں فاصلے پیدا ہوئے، اب اِس خلیج کو پاٹنے کے لیے آپ اُن مولوی صاحبان کو کمپیوٹر اور انگریزی سکھا کر عصری تقاضوں سے جوڑنا چاہتے ہیں، یہ ایسے ہی ہے کہ آدمی کے سر میں درد ہو اور اُس کی ٹانگ کاٹ دی جائے۔ دین کا عالم دینی علوم ہی میں اختصاص پیدا کرے گا، وہ عالم ہونے کے ساتھ ساتھ طب، سائنس اور دیگر علوم کا ماہر نہیں ہو گا۔ لیکن اگر وہ اپنے شعور سے دین کا عالم بنے گا تو زندگی کے ہر شعبے میں دین کی relevance کو تلاش کرنے کا عمل کر سکے گا۔ اِسی سے وہ سوسائٹی میں اجنبی نہیں ہو گا۔

علیزے نجف: میرے علم کے مطابق اپ کا شجرۂ نسب خواہ والد کی طرف سے ہو یا والدہ کی طرف سے، دونوں ہی کی طرف سے اعلیٰ علمی شخصیات سے جا ملتا ہے، اس طرح سے بہت کچھ آپ کو ورثے میں ملا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ اس طرح کا علمی ورثہ کسی فرد کی زندگی میں کیا کردار ادا کرتا ہے۔ عام خاندان میں پیدا ہونے والا انسان ان سے کس طرح مختلف ہوتا ہے؟

محمد حسن الیاس: یقیناً، اثر ڈالتا ہے۔ ہمارے ہاں اگرچہ اس اثر کو منفی انداز میں لیا جاتا ہے اور علمی موروثیت کو ایک گالی بنا دیا گیا ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ آپ کے آبا و اجداد کی روایات اور اُن کی صحبت، معاشرے میں اُن کی شناخت، آپ کے تصور حیات، اخلاقی پرداخت، معاملات میں تدبر اور بڑے اہداف متعین کرنے سے لے کر شخصیت سازی کے ہر ہر پہلو پر اثر انداز ہوتی ہے۔ بڑے لوگ دراصل اپنے خیالات کو سب سے پہلے اپنی اولادوں ہی میں مجسم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اولاد نا اہل ہو تو پیغمبر بھی اُن پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ ہمارے ہاں سیاست سے لے کر وکالت تک اور طب سے لے کر تجارت تک ہر ہر شعبے میں آپ کو اِس میراث کے مثبت اثرات نظر آئیں گے۔ ایک عام انسان کی نسبت یہاں مراحل فطری طور پر جلدی طے ہوتے ہیں۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

قومی منظر نامہ پر آنے میں وہ مزاحمتیں نہیں ہوتیں، اِس طرح یہ نظریات کے استحکام کا باعث بنتی ہیں۔

ہمارے ہاں خرابی یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ جب نااہلی کو موروثیت کے نقاب میں چھپا کر تقاضا کیا جاتا ہے کہ زمانہ اُسے قبول کرے، ورنہ یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے استحکام کے لیے یہ ایک نعمت سے کم نہیں۔ مغرب نے، البتہ یہ کیا ہے کہ بڑے لوگوں کی بصیرت کو collective wisdom میں ڈھالا ہے، بڑے لوگوں کو اچھے ادارے replace کرتے ہیں۔ تعلیمی شعور نے اِس کام کو تیز کیا ہے۔ تاہم یہ فطری تقاضا آپ کو وہاں بھی نظر آتا ہے کہ چند بڑے خاندان ہی بہر کیف سیاست اور معیشت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ بس وہاں لوگوں کے سامنے آنے کے عمل میں سماجی حرکیات کی تائید، ہماری نسبت تیز ہے۔ نئے خانوادے جلدی پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن موروثیت ہی اِن نظریات کی legacy کو آگے بڑھانے کا سبب بنتی ہے۔

علیزے نجف: آپ معروف و مایۂ ناز مذہبی اسکالر جاوید احمد غامدی صاحب سے از حد متاثر ہیں، آپ ان کے مشن میں ان کے ساتھ شانہ بہ شانہ کھڑے ہوئے ہیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ایک وقت تھا جب آپ غامدی صاحب کے نقطۂ نظر پر برملا تنقید کرتے تھے۔ کیا یہ صحیح ہے؟ پھر ایسا کیا ہوا کہ آپ نے صرف تنقید ہی نہیں چھوڑی، بلکہ ان کی شاگردی بھی اختیار کر لی اور آج آپ اپنے اس پچھلے تنقیدی رویے کے بارے میں کیا کہنا چاہیں گے؟

محمد حسن الیاس: غامدی صاحب کی جن چیزوں نے ہمیں پرانی راہوں سے جدا کیا، وہ تین ہیں:

ایک علمی رویہ،

دوسرے اخلاقی بلندی،

تیسرے تلاش حق کی جستجو۔

علمی رویہ دراصل آپ کو یہ بتاتا ہے کہ جذبات اور قائم شدہ تصورات سے اوپر اٹھ کر استدلال کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ اُنھوں نے یہ کام ماضی کی پوری علمی روایت پر کر کے بتا دیا کہ روایت کی بناے استدلال کیا ہے اور اِس کے مقابل میں فراہی مکتب فکر کہاں کھڑا ہے، یہی اصل علم ہے کہ آپ کے پاس جو کچھ معلومات کے انبار ہیں، جو کچھ گہری اور پرانی روایات ہیں، جتنی بھی بڑی شخصیات زیر بحث ہیں، اُن کے نتائج فکر اور اثرات سے آنکھیں بند کر کے اُن کی اصل دریافت کی جائے اور اُس کا بے رحمانہ تجزیہ کیا جائے۔ پھر علمی رویہ سکھاتا ہے کہ تحصیل علم کے مراحل کیا ہیں۔ اِس سے غور و فکر کے کچھ ایسے اصول جنم لیتے ہیں جن کی بنیاد علم و

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

عقل کے مسلمات پر ہوتی ہے۔ باقی عمارت پھر اِنھی پر کھڑی ہوتی ہے۔ جہاں ہر ہر اطلاق اصول کی اِسی جڑ سے پھوٹتا ہے۔ایسے ایک منظم اور مربوط نظام فکر پیدا ہوتا ہے، چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ غامدی صاحب نے اس ضمن میں ایک نئی دنیا پیدا کی ہے اور وہ قائم شدہ تصورات کی تنقیح اور استدلال کے تجزیہ کی دنیا ہے۔اِسی کو میں علمی رویہ کہتا ہوں۔

دوسری چیز اُن کی اخلاقی بلندی ہے۔غامدی صاحب کے اِس پہلو کا اُن کے ناقدین اور مخالفین بھی اقرار کرتے ہیں۔ اُن کی پوری زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔ آدمی محض علم سے بڑا نہیں بنتا۔اِس علم کو اُس کی شخصیت کا حصہ بننا ہوتا ہے۔ اختلاف راے کیسے کیا جاتا ہے، دنیا کو غامدی صاحب نے سکھایا۔ مجھ سے اکثر لوگ پوچھتے ہیں کہ آپ نے اتنا وقت دین کے ایک بڑے عالم کے ساتھ گزارا کسی کرامت کا ظہور دیکھا؟ تو میں عرض کرتا ہوں کہ جی ہاں، بالکل دیکھا، اور وہ کرامت یہ ہے کہ ایک شخص جو گھر کے باہر ہے، وہی گھر کے اندر ہے۔ میں ایک دہائی سے زیادہ عرصہ سے اُن کی خدمت پر مامور ہوں، مالی امور سے لے کر اُن کے شخصی معاملات تک، سفر و حضر کا امین رہا، خلوت و جلوت کا ساتھی ہوں، اندرو باہر سے واقف ہوں۔ کسی اور شخص کے بارے میں شاید یہ دعویٰ نہیں کر سکتا ہے، لیکن غامدی صاحب کے بارے میں پورے اعتماد، یقین اور اذعان سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اخلاق کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہیں۔ جب کبھی اُنھیں کسی مشتبہ معاملے میں اپنے رویہ کی تعیین کرنی ہو تو انھوں نے ہمیشہ اپنے لیے عزیمت کا راستہ ہی اختیار کیا ہے۔

تیسری چیز اُن کی تلاش حق کی جستجو ہے۔ یہ وہ پہلو ہے جو اُنھیں زندہ رکھتا ہے۔ ہر ایک سے سیکھنے کی خواہش۔ ہمیشہ اپنی آرا پر نظر ثانی کا جذبہ۔ آپ رات دو بجے بھی دروازہ کھٹکھٹا کر اُنھیں نیند سے جگا کر کہہ دیں کہ میں آپ کی فلاں علمی راے کی غلطی واضح کرنے آیا ہوں تو آپ شاید اُن کی سرشاری کا اندازہ نہ لگا سکیں۔ آپ اُن کی مجلس میں کبھی خود کو چھوٹا محسوس نہیں کریں گے۔ ہر ہر لمحہ اُن کی زندگی کا اِسی میں بسر ہوتا ہے کہ اپنی علمی، فکری اصلاح جاری رہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آپ کو اُن کی آرا کی تبدیلی بھی نظر آتی ہے۔ یہی وہ پہلو ہے جو پیغام دیتا ہے کہ یہ شخص کسی نئے فرقے کا بانی نہیں، بلکہ سچائی کا ایک "طالب علم" ہے۔

علیزے نجف: کہتے ہیں اختلاف رحمت ہے، بشرطیکہ اس کے ساتھ احترام بھی پایا جاتا ہو۔ عالمی سطح پر مسلمانوں کی جو حیثیت ہے، ظاہر ہے اس کی وجہ سے حکومتیں بہ آسانی ان پر دہشت گردی کا لیبل لگا دیتی ہیں، 9/11 کے حادثے نے اس پر مہر لگا دی۔ میرا سوال یہ ہے کہ مسلمان قوم کو کس طرح

اپنے آپسی اختلافات کو مینیج کر کے خالص قرآن کی تعلیمات کو دوسری اقوام تک پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیے، تاکہ اسلام سے متعلق ان کی غلط فہمی دور کی جا سکے۔ کیا ''المورد'' کا ادارہ اس کے لیے کوئی لائحۂ عمل رکھتا ہے؟

محمد حسن الیاس: ''المورد'' کی تحریک کا لائحۂ عمل استاذ مکرم جناب جاوید احمد غامدی کے قلم سے ۱۹۸۳ء میں لکھا گیا تھا۔ یہی وہ مقاصد ہیں جو اُن کے رسالے ''اشراق'' میں ہر ماہ شائع ہوتے ہیں۔اُن کے مطابق ادارے کی تاسیس کے بنیادی مقاصد میں یہ چیز شامل ہے کہ امت میں قرآن و سنت کی بنیاد پر تفقہ فی الدین کی روایت کی تجدید کی جائے، جیسے ہی آپ دین کو فقہ، کلام، تصوف، تاریخ اور فلسفے کی آمیزش سے الگ کر کے پیش کرتے ہیں تو وہ سارے دینی مسائل جو مذہبی فکر اور بعض دینی سیاسی تحریکوں نے پیدا کر دیے ہیں، آپ سے آپ ختم ہو جاتے ہیں۔اِس مقصد کے لیے خود غامدی صاحب نے کم و بیش پچاس سال اور فکر فراہی اور دبستان شبلی کی روایت نے ایک صدی سے زیادہ عرصہ صرف کیا اور دین کی وہ تعبیر پیش کی ہے جس میں اصل اور منہاج کی حیثیت قرآن مجید کو حاصل ہے۔یہی دینی فکر دراصل ان تمام مسائل کا جواب بھی ہے جن کی جانب آپ نے اشارہ کیا۔ ہمیں حالات سے متاثر ہو کر کسی بیانیہ کو رد کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ صحیح دین کو لوگوں کے سامنے رکھ دیں، سارے مسائل اسی سے حل ہو جائیں گے۔ادارے کی سطح پر ہماری کوشش ہے کہ غامدی صاحب کے اِس فکر کو جدید عہد کے تقاضوں کے مطابق نہ صرف یہ کہ دنیا تک پہنچائیں، بلکہ خود اِس فکر کی تنقیح کا کام جاری رہے تاکہ جس مقصد کے لیے یہ ادارہ بنا ہے، وہ خود سے اِس کا شکار نہ ہو جائے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

علیزے نجف: ہر معاشرے کی اپنی تہذیب و ثقافت ہوتی ہے، اسی طرح مغرب و مشرق کی بھی ہے جو کہ ایک دوسرے سے کافی مختلف ہیں۔ ہمارے یہاں مغربی تہذیب کو برملا لعن طعن کیا جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے باوجود لوگ اس کو اپنا رہے ہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ آپ نے ان دونوں معاشرتی تہذیبوں کو قریب سے دیکھا ہے، کیا واقعی مغربی تہذیب اخلاقیات سے عاری ہے اور لوگوں کی اس نفرت کے پیچھے کس طرح کی ذہنیت کار فرما ہے، آپ ان دونوں میں کیا کچھ مماثلت پاتے ہیں؟

محمد حسن الیاس: ہمارے ہاں مغرب سے نفرت کی اصل وجہ مغربی تہذیب کا براہ راست مطالعہ نہیں، بلکہ یہ مغربی طاقتوں کے سیاسی اقدامات کا ردعمل ہے۔ آپ جانتی ہیں کہ مغرب ہی کی یہ طاقتیں دوسری جنگ عظیم کی فاتح ہیں۔ اقوام متحدہ میں اِن فاتحین کو ایک قاعدہ میں لا کر کچھ پابند تو کیا گیا ہے، لیکن اب بھی دنیا کا نظم

دراصل انھی کے ہاتھ میں ہے۔ سرمایہ بھی، ٹیکنالوجی بھی اور سیاسی برتری بھی۔ دنیا کی وہ امامت جو صدیوں مسلمانوں کے پاس رہی ہے، اب ان کے پاس ہے۔ اب یہ فاتح عالم ہیں، اِن طاقتوں نے ہمیں نیم خود مختاری یا کسی حد تک آزادی دی ہوئی ہے۔ اصلاً دنیا اِنھی کی باج گزار ہے۔ یہ اپنی طاقت سے ہم پر ہر ہر پہلو سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ کوئی سیاسی لیڈر یا جماعت اِن کی اِس حیثیت کو چیلنج کرتی ہے تو یہ اُسے سبق بھی سکھاتے ہیں۔ چنانچہ اِن کا ایک عالمی چہرہ ہے جس سے مسلمان بالعموم نفرت کرتے ہیں۔ لیکن مغرب کو یہ امامت ایسے ہی ایک دن میں حاصل نہیں ہوئی۔ اُنھیں یہ ترقی صدیوں کی محنت سے ملی ہے۔ اُن کی ترقی کی دو بنیادیں ہیں: پہلی سماجی علوم میں ترقی، دوسری سائنس اور ٹیکنالوجی میں برتری۔ ریاست اور مذہب کا تعلق، جمہوریت کی قدر، قانون کی حکمرانی، حق خود ارادی اور بنیادی انسانی حقوق، اِس تہذیب کا ہر گوشہ اِن اقدار میں پروان چڑھا ہے۔ اِسی طرح سے انڈسٹریل ریوولوشن نے اِنھیں وہ راہیں دکھائیں جس سے یہ واقعہ ہے کہ انسان کہتا ہے، محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ ہمیں اُن سے اِن دونوں پہلوؤں سے بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام کے حقیقی اثر سے جو تہذیب پیدا ہوتی ہے اُس کا مغربی تہذیب سے موازنہ کیا جائے تو ہماری تہذیب حفظ فروج، حفظ مراتب اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جو تصورات پیش کرتی ہے، مغربی فکر جوہری لحاظ سے اُنھیں تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ وہاں آزادی اصل قدر ہے، جب کہ ہماری دینی تہذیب کی بنیاد ''خدا کے سامنے جھکنے'' پر ہے۔

علیزے نجف: آپ Theology Researcher ہیں، آپ نے مذہب کو ہر زاویے سے پڑھا اور سمجھا ہے، ہمارے یہاں ایک طبقہ ایسا ہے جو قرآن کے ذریعے سے سائنس کی تشریح کرتا ہے اور ایک طبقہ وہ ہے جو سائنس کی شدید مخالفت کرتا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ ان دونوں طبقوں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ کیا قرآن اور سائنس دو الگ الگ علم ہیں یا ان دونوں میں واقعی کوئی ربط ہے؟

محمد حسن الیاس: کسی بھی علم کا دوسرے علم سے تقابل دو پہلوؤں سے اُس وقت کیا جاتا ہے، پہلا، جب دونوں کی بنائے ثبوت یکساں ہو۔ دوسرے، دونوں کا موضوع مشترک ہو، یعنی دونوں ایک ہی سوال کا جواب دے رہے ہوں۔

علم کی بنیاد کیا ہے؟ ثبوت کے اعتبار سے دیکھیں تو دنیا میں علم کے متعین ذرائع ہیں۔ میرے حواس کے ظاہری اور باطنی حاصلات، اور عقلی استنباط کے نتائج۔ اِنھی سے تجربہ و مشاہدہ ہوتا ہے۔ انھی سے استنباط و استقرا

کا عمل جنم لیتا ہے۔ سائنس کی بنیاد اِن ذرائع پر ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر مذہب بھی میرے تجربے، مشاہدے یا عقلی استنباط کے نتائج سے وجود پذیر ہوتا ہے تو سائنس کے ساتھ اُس کا تقابل بنتا ہے۔ لیکن مذہب کا ثبوت تو اِن سب ذرائع علم سے ماورا پیغمبر کو آنے والی وحی پر ہے، تو یہ ایک علیحدہ ذریعۂ علم ہے۔ میں مسلمان ہوتا ہوں تو پیغمبر کی گواہی پر کتاب، فرشتوں، خدا اور آخرت پر ایمان لاتا ہوں۔ پیغمبر کا یہ دعویٰ اگرچہ میری فطرت کی آواز ہے، میرے عقلی سوالوں کا جواب ہے، لیکن اِس کا ذریعہ ''وحی'' ہے۔ لہٰذا سائنس اور مذہب، دونوں کی بنائے ثبوت ہی الگ ہے تو تقابل کیسا؟

اب آیئے موضوع پر۔ سائنس کا موضوع ہے زندگی، اُس میں سہولت، جب کہ مذہب کا موضوع ہے موت، اُس کی تیاری۔ دونوں جوابات ہی الگ الگ سوالوں کے دے رہے ہیں۔ لہٰذا جو لوگ سائنس کو مذہب کے مقابلے میں کھڑا کرتے ہیں اور جو اِس سے مذہب کی تائید کرتے ہیں، دونوں ہی غیر علمی رویہ اپناتے ہیں۔

علیزے نجف: آپ جاوید احمد غامدی صاحب کے قائم کردہ ادارہ ''المورد'' سے وابستہ ہیں، مجھے یہ بتائیں المورد کی شاخیں دنیا میں کہاں کہاں قائم ہو چکی ہیں۔ المورد کی خدمات کی نوعیت کیا ہے، انڈیا میں المورد کی شاخ کا قیام کب عمل میں آیا اور یہاں سے ملنے والا رسپانس کیسا رہا، اس حوالے سے ہمارے قارئین کو تھوڑا آگہی دیں؟

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد حسن الیاس: ''المورد'' کی تاسیس کا مقصد دین میں قرآن و سنت کی بنیاد پر غور و فکر اور اُس کی صحیح تعبیر پیش کرنا ہے۔ اِس پیغام کا آغاز اردو زبان میں پاکستان سے کم و بیش چالیس سال پہلے ہوا تھا۔ صدیوں سے قائم تصورات کے مقابل میں ایک علیحدہ دینی فکر پیش کرنا کوئی آسان کام نہیں، جب کہ خود اِس کی اپنی دینی فکر کی تنقیح کا عمل ابھی جاری ہو۔ یہ ادارہ اپنے محدود وسائل میں اِس دعوت کو دنیا تک پہنچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ جدید مواصلاتی رابطوں کے باعث بیرون ملک مقیم اردو پڑھنے اور جاننے والے احباب نے بھی اِس تحریک سے تعلق کا اظہار کرنا شروع کیا ہے۔ چنانچہ اُنھی کی کوششوں سے پاکستان کے بعد برطانیہ، آسٹریلیا، جرمنی، امریکا، کینیڈا اور ہندوستان میں باقاعدہ ادارہ قائم ہے۔ ادارے نے بے شمار کتابیں شائع کیں، غامدی صاحب کی فکر کو سمجھنے والے علما پیدا کیے۔ یہ سب ادارے اِنھی عام لوگوں کی محبت اور محنت کا ثمر ہیں اور اپنے نہایت محدود وسائل میں علم و تحقیق اور نشر و اشاعت میں سر گرم ہیں۔

جہاں تک بات ہے اداروں کی ترقی کی، تو اِس ضمن میں دو باتیں عرض ہیں: یہ بات یاد رکھیں کہ ادارے

عمارتوں اور سرمائے سے نہیں بنتے، بلکہ افراد سے بنتے ہیں۔ جو تحریک اِن افراد کی متنوع شخصیات اور صلاحیتوں کو لے کر چلنے کا مزاج پیدا کر لے، وہ استحکام پا لیتی ہے، اور جو تحریک لوگوں کی شخصی آزادی اور ذوق اور مزاج کو تبدیل کر کے اُنھیں فکری روبوٹس بنانے کا عزم کر لے، دنیا کی ساری طاقت اور سب سرمایہ بھی اُسے استحکام نہیں بخش سکتا ہے۔ مغرب میں جا کر دیکھیں جہاں ہر علم و فن کے بڑے ادارے موجود ہیں، وہاں یہ فضا ہے۔ تخلیقی ذہن اپنی صلاحیتوں کے ظہور کے لیے صرف اور صرف آزادی چاہتا ہے۔ اداروں کی ترقی کا دوسرا پہلو روح عصر کو پہچاننے میں ہے۔ جو ادارے اپنے زمانے کی حرکیات اور trends سے لاتعلق ہو کر کام کرنا چاہیں گے، اُن کی تمام محنت ڈھول کی طرح بیٹھ جائے گی۔ لیکن اگر آپ نے اپنے زمانے کی طاقت اور tools کو پہچان لیا اور اُس کے مطابق منصوبہ بندی کی تو نئی دنیا کی روشن راہیں آپ کی منتظر ہوں گے۔ اِن معاملات میں ہماری تحریک کو ابھی بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے۔

تاہم اِس سب کے باوجود زمانہ بڑا صراف ہے، وہ کھوٹے کو تو قبول کرتا نہیں، کھرے کو بھی بڑی مشکل سے کرتا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا ابتدا سے تقابل کیا جائے تو یہ کہنے میں حرج نہیں کہ اس وقت ہر دینی فکر اِس کے پیغام کا جواب دینے میں مشغول ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ فکر اُن کے منہاج پر کچھ بنیادی ضرب لگاتی ہے۔ باقی اِس کے اثرات اُس درجے کے ہوں جو بقیہ روایات کے ہیں، اِس میں ابھی بہت وقت لگے گا۔

علیزے نجف: آپ ایک ایجو کیشنسٹ بھی ہیں، اس حوالے سے آپ نے اب تک کئی تجدیدی کام کیے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس سلسلے میں آپ اپنی اب تک کی گئی تجدیدی عمل کی کوششوں کے بارے میں بتائیں اور یہ بھی بتائیں کہ اس حوالے سے مستقبل میں کیا ہدف رکھتے ہیں؟

محمد حسن الیاس: اللہ تعالیٰ کا مجھ پر اِس پہلو سے خاص کرم ہے کہ اپنی طالب علمی کی اِس مختصر سی ابتدائی زندگی میں بڑے لوگوں کی صحبت میسر ہے۔ اِن بڑے لوگوں کو دیکھ کر دو باتیں پہلے دن پلے باندھ لی تھیں: پہلی یہ کہ اپنے آپ کو پہچانو، اپنی صلاحیت کا جائزہ لو۔ دوسری، روح عصر کو سمجھو۔ اِنھی دو چیزوں کو سامنے رکھ کر میری گذشتہ چند سالوں میں یہ کوشش رہی ہے کہ فکر فراہی کی ہر ہر پہلو سے توضیح خود اِس فکر کے بڑے علما کے ذریعے سے ہو۔ اِس ضمن میں استاذ مکرم جناب جاوید احمد غامدی صاحب کے ساتھ سیکڑوں گھنٹوں پر محیط تحقیقی اور علمی مکالموں کے سلسلے کا آغاز کیا اور اُن کے علم کو محفوظ بنانے، اُن پر ہونے والے اعتراضات کے پس منظر میں اُن کے ذہنی سفر کی تحلیل اِسی طرح بڑے سماجی اور معاشرتی مسائل، عالمی تنازعات، انسانی شخصیت،

تہذیبوں کے عروج و زوال، غرض یہ کہ ہر ہر پہلو سے استاذ مکرم کے علم کا ایک ایسا ذخیرہ مرتب کیا جس سے ان شاءاللہ لوگ صدیوں استفادہ کریں گے۔ یہی معاملہ اُن کی نگرانی میں حدیث پر تحقیق کا ہے۔اِسی طرح سے زمانے کے بدلتے حالات کی روشنی میں فکر کو جدید اسٹائل، مثلاً اینی میشنز، ڈاکیومنٹری میں پہنچانے کی کوششوں کا بھی آغاز کیا ہے، جہاں خالص فنی مسائل کو بھی تفریحی اسلوب میں عام آدمی کی تفہیم کی صورت دینا پیش نظر ہے۔

علیزے نجف: تعلیم کے حوالے سے ایک سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ہمارے یہاں تعلیم یافتہ طلبا کی تعداد تو روز بروز بڑھ رہی ہے، لیکن تربیت کا دائرہ تنگ ہوتا جا رہا ہے، کیونکہ اب تعلیم ایک اچھا انسان بننے کے لیے نہیں، بلکہ ایک اچھی جاب پانے کے لیے حاصل کی جاتی ہے، آپ اس پورے منظر نامے کے بارے میں کیا کہنا چاہیں گے، اس غالب رجحان کے پیچھے کن علتوں کو آپ پاتے ہیں اور تعلیمی ادارے اس کے لیے کہاں تک ذمہ دار ہیں؟

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد حسن الیاس: یہ بات بالکل درست ہے۔ علم اصل میں حقائق کی معرفت کا نام ہے۔ یہ ایک consistent عمل ہے۔اِس کا آغاز انسان اپنی فطرت کے مطالعے سے کرتا ہے۔ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟اُس کے خاتمے کے بعد کیا ہوگا؟اُس کی شخصیت کیا ہے؟اِس میں موجود اخلاقی شعور کیا اقدار پیدا کرتی ہیں؟اِن سب سے اُس کا ایک تصور حیات بنتا ہے۔ علم کا یہی سفر کائنات کے مشاہدے تک پہنچتا ہے تو مختلف مادی علوم کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ لہٰذا یہ ہو نہیں سکتا کہ انسان علم کا حصول چاہے اور وہ صرف دنیوی فنون تک محدود ہو جائے۔ یہ تضاد ہے اور انسان ہر چیز میں جی سکتا ہے، تضاد میں نہیں جی سکتا۔ لہٰذا آج کل ہمارے تعلیمی اداروں میں لوگوں کو جو تعلیم دی جاتی ہے، اُس کا مقصد محض ہنر مند حیوانات پیدا کرنا ہے۔ انسان کی اخلاقی تربیت اُن کی دل چسپی کا موضوع نہیں۔ یہ صورت حال ایک دن میں پیدا نہیں ہوتی۔ قوموں کی زندگی میں یہ اخلاقی انحطاط صدیوں میں آتا ہے۔ مسلمانوں کو پہلے اخلاقی میدان میں شکست ہوئی ہے، پھر مادی میں۔

علیزے نجف: ہر دور میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہی ہیں، ہر دور کی اپنی تہذیب و ثقافت رہی ہے۔ ایک وقت تھا جب ادب اور اخلاقی ثقافت کو غلبہ حاصل تھا، آج ہر شعبے میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور دورہ ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں کیا عملی سطح پر مذہب کی اہمیت و معنویت میں کمی واقع ہوئی ہے یا لوگوں کا مذہب کی طرف رجحان پہلے کے جیسا ہی ہے، آپ کا اس حوالے سے کیا مشاہدہ و تجربہ رہا ہے؟

محمد حسن الیاس: مذہب انسان کے جس مسئلہ کا جواب دیتا ہے، وہ ہر دور کے انسانوں کا اولین مسئلہ رہا ہے، یعنی کائنات کی حقیقت کیا ہے اور موت کے بعد کیا ہو گا؟

لوگ عام طور پر اس دور کی چکا چوند اور سائنسی ایجادات کے غوغے میں پریشان ہو جاتے ہیں کہ یہ سب کچھ اسے اصل سوالات سے بے نیاز کر رہا ہے، لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے۔ موجودہ دور کی ہر ترقی دراصل انسان کو اور زیادہ شدت سے ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی مہمیز فراہم کر رہی ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اِس سوال کا علمی جواب صرف اور صرف مذہب نے دیا۔ آج بعض لوگ سائنسی انکشافات کی بنیاد پر کچھ اسطورے قائم کر کے ان بڑے سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ مذہب کی درست تعبیر کو صرف اُن کے مقابلے میں رکھ دیں تو اِن کی لغویت واضح ہو جائے گی۔ آج کے دور میں آپ کو لوگوں میں جو مذہب بے زاری نظر آتی ہے وہ اصلاً اِس دین کو پیش کرنے والے مذہبی طبقے کے شکنجے سے آزادی کی خواہش ہے۔ مذہب اور مذہبی فکر یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ موجودہ دور عصر حریت اور عصر استدلال ہے۔ اِس میں ہماری قدیم مذہبیت کے خلاف آپ کو ایک بغاوت نظر آتی ہے۔ یہ بے دینی کی علامت نہیں، بلکہ صحیح دین پیش نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔

علیزے نجف: اس دنیا میں اللہ کی ایک بڑی نعمت زندگی ہے، ہر انسان اس کی تعریف عموماً اس میں پیش آنے والے حالات و واقعات سے ہی کرتا ہے، یوں ہر کسی کے نزدیک زندگی کا الگ الگ مفہوم ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ آپ کے نزدیک زندگی کی تعریف کیا ہے اور آپ کی زندگی کا اب تک تجربہ کیسا رہا؟ اس زندگی میں آپ نے جو کچھ سیکھا، اس کو اگر چند لفظوں میں بیان کرنا پڑے تو وہ الفاظ کیا ہوں گے؟

محمد حسن الیاس: میں اگرچہ اپنی عملی زندگی کے ابتدائی مراحل میں ہوں، تاہم میں نے یہ سیکھا ہے کہ زندگی آئیڈیل ازم کا نام نہیں، بلکہ عملی حقائق میں جینے کی راہیں تلاش کرنے کا نام ہے۔ یہ جہد مسلسل کا نام ہے۔ یہ مثبت طرز فکر اپنا کر اپنا حصہ ڈالنے کا نام ہے۔ جو لوگ اِس دنیا کو جنت بنانے کے خواب دیکھتے، زندگی کو پھولوں کی سیج بنا کر جینے کا دم بھرتے اور گلے شکوے، نالہ و فریاد میں وقت گزار دیتے ہیں، زندگی ایک آفت کی طرح اُن پر مسلط ہو جاتی ہے۔ انسان ہمت اور حوصلے کے ساتھ علم و عقل کی روشنی میں، جذبات اور تعصبات سے خالی ہو کر زندگی کو جینے کا آغاز کر دے، خود احتسابی کو اپنا معمول بنا لے، اخلاقی اقدار کی پاس داری

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

کرے، جسے حق سمجھے بلاخوف بیان کرے، تو میرا ایمان ہے کہ عالم کا پروردگار اُس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے، زندگی کی بند شاہ راہیں کھل جاتی ہیں، غیب سے رزق آتا ہے اور دل پر سکینت نازل ہونے لگتی ہے۔

علیزے نجف: انسان ایک معاشرتی حیوان ہے، وہ معاشرے کے ساتھ سروائیو کرتا ہے، اس زندگی کو اجتماعی زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کے علاوہ ایک ذاتی زندگی بھی ہوتی ہے۔ اجتماعی سطح پر تو ہم آپ سے کافی واقفیت رکھتے ہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ ذاتی زندگی میں آپ کا مزاج کیسا ہے؟ مطلب کم گو ہیں، خلوت پسند ہیں یا جلوت پسند، فرصت کے اوقات میں آپ کے مشاغل کیا ہوتے ہیں؟ اتنی مصروف زندگی میں خود کے لیے کیسے وقت نکالتے ہیں؟

محمد حسن الیاس: کسی بڑے آدمی کے ساتھ ایک مشن میں منسلک ہو کر جینا واقعی ایک مشکل کام ہے، لیکن زندگی میں توازن ہی دراصل آپ کی پرفارمنس پر اثر انداز ہوتا ہے۔ میری یہ کوشش ہوتی ہے کہ کام کے ساتھ کچھ نہ کچھ وقت نکالا جائے۔ زندگی کی اصل راحت آپ کا گھر اور رشتے ہیں۔ خدا نے مجھے اولاد دی ہے۔ کوشش ہوتی ہے اُن کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزرے۔ کسی خاص حلقے میں محصور رہنے کا مزاج نہیں بلکہ ہر طرح کے لوگوں میں گھلنے ملنے کا مزاج ہے۔ ذاتی زندگی میں آپ مجھے بہت بے تکلف اور ہنس مکھ پائیں گے۔ تاریخی اور سماجی موضوعات پر بنی فلمیں اور ڈاکیومینٹریز میں بہت شوق سے دیکھتا ہوں۔ اِسی طرح موسیقی سے خاص لگاؤ ہے۔ اچھے کھانے کھانا اور سیر وسیاحت کا بھی شوق ہے۔ خود پکاتا بھی ہوں۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

علیزے نجف: یہ سوال میرا عام موضوع سے ذرا ہٹ کے ہے۔ آپ کا غامدی صاحب کے خاندان سے ایک گہرا اور قریبی رشتہ ہے، ان کی صاحب زادی آپ کے نکاح میں ہیں، یوں آپ دونوں ہی غامدی صاحب کے زیر تربیت رہے اور ان کے زیر سایہ زندگی گزارنے کا سلیقہ سیکھا۔ میرا سوال یہ ہے کہ مریم صاحبہ کی کن دو خوبیوں سے آپ سب سے زیادہ متاثر رہے؟ اس پہلو سے یہ بھی پوچھنا چاہتی ہوں کہ اگر رفیق حیات میں سے کوئی ایک دوسرے سے ذہنی طور پر مطابقت نہیں پیدا کر پا رہا ہو، دونوں الگ الگ پہلوؤں سے سوچنے کے عادی ہوں اور اس کی وجہ سے بچوں کی تربیت پر بھی اثر پڑ رہا ہو تو ایسے میں تعلق کو بہتر بنانے کے لیے کن بنیادی اصولوں پر کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے؟

محمد حسن الیاس: پہلی خوبی یہ کہ وہ میرے ساتھ زندگی کے ہر نشیب و فراز، ہر تنگی و خوش حالی، ہر خوشی و غم میں شکر گزار اور راضی رہیں۔ کبھی شکوہ کناں نہیں ہوئیں۔ مطالبات نہیں رکھے۔ اِس سے جو ذہنی فرحت

حاصل ہوتی ہے، وہ ناقابل بیان ہے۔ اُنھوں نے میرے مشن اور کام اور اِس کی اہمیت کو پہچانا۔ اور اِسے آگے بڑھانے میں کافی کمپرومائزز کیے، لیکن اُن کمپرومائزز کو بھی کبھی گلے کا موضوع نہیں بنایا ہے، بلکہ خوش دلی سے اسے اپنائے ہوئے ہیں۔

دوسری خوبی یہ کہ وہ زندگی کو ایک سلیقے اور نظریہ کے تحت گزارنا چاہتی ہیں۔ سب سے پہلے اپنی اولاد اور پھر معاشرے کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہیں اور ایک بامقصد زندگی گزار رہی ہیں۔ جیسے بچوں کو بنانا چاہتی ہیں، ویسے خود بننے کی کوشش کرتی ہیں۔

جہاں تک تعلق ہے آپ کے اِس سوال کا کہ کامیاب ازدواجی زندگی کا گر کیا ہے؟ تو اِس پر عرض ہے کہ ''پیچھے ہٹنا سیکھیں''۔ آپ کے ساتھ ایک انسان ہے، اُس کی ایک شخصیت ہے، سوچنے سمجھنے کا ایک خاص رخ اور زاویہ ہے، شادی کرنے سے پہلے آپ کو اِن سب حقیقتوں کو قبول کرنا ہے۔ اب اختلاف ہوگا۔ اُس اختلاف میں جینے کا قرینہ پیدا کرنا اصل کامیابی ہے۔ اور اِس کامیابی کا سر رشتہ compromise اور manage کرنا ہے۔ بڑے بڑے مسائل اِسی تدبیر سے حل کیے جا سکتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

علیزے نجف: انٹرویو دیتے ہوئے آپ کے احساسات کیا تھے، سوالات سے کس حد تک مطمئن تھے، اس انٹرویو کے ذریعے سے کیا آپ کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

محمد حسن الیاس: میں اپنے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوتا۔ اپنے استاذ جناب غامدی صاحب کے افکار کا خوشہ چیں اور رجز خواں ہوں۔ اِن کے شاگردوں کی صفوں میں بیٹھنے والا بالکل ابتدائی سا طالب علم ہوں۔ آپ نے طالب علم سے اِس کے موجودہ خیالات جاننا چاہے، اِس امکان کے ساتھ پیش کر دیے ہیں کہ اب تک یہی میرا علم ہے۔ اِس پہلو سے آپ کے سوالات بہت اچھے تھے۔ اصل میں لوگ جواب دینا تو جانتے ہیں، لیکن اچھے سوال کرنے کی ہمارے ہاں کوئی مشق نہیں کی جاتی۔ اچھا سوال ہی دراصل علم کی پہلی سیڑھی ہوتی ہے۔ اگر مجھ سے ایک جملے میں پوچھیں کہ ہمیں غامدی صاحب سے کیا سیکھنا چاہیے تو میرا جواب ہوگا کہ اُن سے ''سوال'' کرنا سیکھیں، یہ اُن کے سوالات ہی تھے جن کے جواب میں نئی دنیائیں پیدا ہو گئیں، یہی میرا پیغام ہے۔

خورشید احمد ندیم

چار اموات

[مفتی محمد رفیع عثمانی، ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، ڈاکٹر ایوب صابر، جسٹس افضل حیدر کی وفات کے حوالے سے لکھا گیا۔]

ہمارے گلستان علم میں ویرانی کا سماں ہے۔ چند دنوں میں اجل نے چار گل ہاے رنگارنگ اچک لیے۔

پہلے خبر آئی کہ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی ہم میں نہیں رہے۔ برصغیر نے گذشتہ نصف صدی میں جو بڑی علمی شخصیات پیدا کیں، وہ ان میں سے ایک تھے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ دو نسلوں کے علمی ذوق کی تعمیر اور شعوری بیداری میں ان کا حصہ ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنھیں اپنے عہد کے علمی چیلنج کا ادراک تھا اور انھوں نے اس کا سامنا کرنے کی مقدور بھر کوشش کی۔

ان کا تعلق اس نسل سے تھا جو فکر مودودی کے آغوش میں بڑی ہوئی۔ اسے آپ دبستان شبلی کا تسلسل بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ مکتب فکر جہاں دین کی تجدید واحیا کا قائل ہے، وہاں روایت سے وابستگی کو اپنی کم زوری نہیں، قوت سمجھتا ہے اور یوں اس کے سائے میں آگے بڑھتا ہے۔ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کا اصل میدان تو معیشت تھا، لیکن انھوں نے فکر اسلامی کو بھی اپنی علمی سعی وجہد کا مرکز بنایا۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں انھوں نے امام ابو یوسف کی ''کتاب الخراج'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ معیشت کی اسلامی تشکیل کے باب میں انھوں نے بنیادی کام کیا۔ میرا احساس ہے کہ اس موضوع سے دل چسپی رکھنے والا کوئی طالب علم ان کی تحقیق اور تصانیف سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

فکر اسلامی کے باب میں ان کی کتاب ''مقاصد شریعت'' دینی لٹریچر میں اہم اضافہ ہے۔ ہماری علمی روایت میں جب مقاصد پر بحث ہوئی تو ابتدا میں ان مقاصد کو پانچ تک محدود رکھا گیا۔ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی نے اس فہرست میں اضافہ کیا اور یہ بتایا کہ دور جدید نے جو مسائل پیدا کر دیے ہیں، وہ متقاضی ہیں کہ انھیں پانچ تک

محدود نہ رکھا جائے۔ یہ کتاب ان کا ایک علمی کارنامہ ہے۔

ایک اور شخصیت، جن کا چند دن پہلے انتقال ہوا، مفتی محمد رفیع عثمانی ہیں۔ مفتی صاحب، صاحب ''معارف القرآن'' مفتی محمد شفیع مرحوم کے بڑے صاحب زادے تھے۔ یہ خاندان علماے دیوبند کی اس شاخ سے تعلق رکھتا ہے جو تقسیم ہند کے مسئلے پر کانگرس کے بجاے مسلم لیگ کا ہم نوا تھا۔ یہ گھرانا علم میں اکابر علماے دیوبند کے منہج ہی کا پابند رہا، لیکن اس کے باوصف اس کے ہاں ایک فراخی رہی، مفتی صاحب جس کی علامت بن کر سامنے آئے۔ یہ تعبیر واستنباط میں شدت پسند نہیں تھے۔ مفتی رفیع صاحب نے قومی اور عوامی سطح پر مسلکی اختلاف کو زیر بحث لانے سے گریز کیا اور اس کی حوصلہ شکنی کی۔ مفتی صاحب اور ان کے مدرسے کی اس فراخ دلی کا دائرہ اگرچہ روایتی مسالک ہی تک محدود رہا، لیکن انتہا پسندی کے اس دور میں اسے بھی غنیمت سمجھنا چاہیے۔

مفتی صاحب کا ایک اور امتیاز یہ رہا کہ انھوں نے اپنے مدرسے کو اقتدار کی سیاست سے الگ رکھا۔ ان کے مسلک کی سیاسی جماعت، جمعیت علماے اسلام، قومی سیاست میں ہمیشہ فعال رہی، لیکن مفتی صاحب اور ان کے مدرسے نے اس سے عملاً لاتعلقی اختیار کیے رکھی۔ انھوں نے ہماری روایت کے ساتھ اپنا تعلق نبھایا جس میں علما نے خود کو تعلیم اور تذکیر تک محدود رکھا ہے۔ وہ کبھی اقتدار کے کھیل کا حصہ نہیں بنے۔ یوں انھوں نے علما کے اس وقار کی حفاظت کی، جسے اقتدار کی سیاست میں شریک 'علما' نے شدید نقصان پہنچایا۔

تیسری اہم شخصیت ڈاکٹر ایوب صابر کی ہے۔ اقبالیات کا کوئی طالب علم ان کی تحقیق اور تصانیف سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ تفہیم اقبال کے ساتھ، ان کا اہم موضوع اقبال پر ہونے والے اعتراضات ہیں۔ علامہ اقبال کے دینی تصورات، ان کے افکار اور ان کی ذات سے وابستہ بعض سوالات ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کا موضوع رہے۔ اقبال پر تحقیق کرنے والے بالعموم ان کے شخصی اور فکری سحر سے نہیں نکل سکے۔ انھوں نے اقبال کا دفاع یوں کیا جیسے کوئی مرید اپنے پیر کا دفاع کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا معاملہ بھی ایسا ہی رہا۔ انھیں اقبال سے والہانہ لگاؤ تھا اور ان سے مل کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اقبال کا دفاع ایک دینی فریضہ سمجھ کر کرتے ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس محبت نے ان کے تحقیقی کام کو متاثر کیا ہے۔ انھوں نے تحقیق کے بنیادی مطالبات کو پورا کرتے ہوئے اپنی اس محبت کو نبھایا ہے۔ اعتراضات اور ان کے جواب کو انھوں نے تین جلدوں میں جمع کر دیا تھا۔ ان اعتراضات پر مختلف لوگوں نے کام کیا ہے، لیکن یہ متفرق مضامین میں بکھرا ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے انھیں یکجا کر دیا۔ اس کتاب کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال پر اعتراضات بالعموم کتنے سطحی اور بے خبری پر مشتمل ہیں۔ ہر بڑے مفکر اور متکلم و فلسفی کے افکار، علم کی دنیا میں زیر بحث رہتے ہیں۔ ان پر تنقید بھی ہوتی ہے اور اس سے ان کی عظمت کم نہیں ہوتی، تاہم ہمارے ہاں کچھ لوگ اقبال شکنی کو مقصد حیات بنائے

ہوئے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ اقبال کے نام سے قائم اس قصر علم و فکر کو گرانے ہی سے ان کا جھونپڑا دکھائی دے سکتا ہے۔ڈاکٹر ایوب صابر نے اس غیر علمی رویے کا تعاقب کیا ہے۔

جسٹس افضل حیدر بھی انھی دنوں میں رخصت ہوئے۔ جسٹس صاحب نے خود کو مسلکی امتیازات سے بلند کرتے ہوئے دین کو سمجھنے کی کوشش کی اور قرآن مجید کو خاص طور پر اپنے مطالعے کا مرکز بنایا۔چند ماہ پہلے ہی مضامین قرآن پر ایک کتاب شائع ہوئی جس کا تعارف اس کالم میں کرایا گیا تھا۔یہ وہ استفسارات تھے جو قرآن مجید کے باب میں ان سے کیے گئے اور انھوں نے عام فہم انداز میں ان کے جواب دیے۔ قیدیوں کے حقوق پر بھی انھوں نے اہم کام کیااور جیل کے نظام میں اصلاحات کے لیے سفارشات مرتب کیں۔

یہ شخصیات ہفتے عشرے کے دوران میں دنیا سے رخصت ہوئیں۔ان کا وجود ہماری علمی زندگی کو باوقار بنائے ہوئے تھااور اس کی زندگی کی علامت تھا۔میں رسماً نہیں، ذمہ داری کے ساتھ یہ راے رکھتا ہوں کہ ان کے جانے سے ایک بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی مرحوم جیسے لوگ عالمی سطح پر ایک علمی محاذ سنبھالے ہوئے تھے اور انھوں نے دنیا کو یہ باور کرایا تھا کہ معیشت کی تشکیل کے لیے اسلام بھی ایک نقطۂ نظر رکھتا ہے جس کی اساس فلاح انسانیت ہے۔ مفتی صاحب کو دیکھ کر ہمیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ مسلم سماج میں علما کا کردار کیا ہے اور اس باب میں ہمارے اسلاف کا رویہ کیا تھا۔ڈاکٹر ایوب صابر نے اقبال کے ساتھ ہمارے زندہ تعلق کو قائم رکھا۔ جسٹس افضل حیدر نے سکھایا کہ مسلکی تنوع رکھنے والے سماج میں کیسے جینا چاہیے۔

سماج کی تشکیل میں بہت سے افراد بہ یک وقت اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔اہل علم کو اس لیے امتیاز حاصل ہے کہ وہ معاشرے کی سمت کو درست رکھتے ہیں۔وہ باہمی اختلاف کے باوجود مجموعی طور پر سماج کی بہتری میں ایک کردار ادا کرتے ہیں۔ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کا تعلق پاکستان سے نہیں تھا، لیکن مسلم تہذیب سے ضرور تھا۔ان کی بہت سی کتب پاکستان سے شائع ہوئیں۔یوں وہ ہم سے الگ نہیں تھے۔اسی طرح ڈاکٹر ایوب صابر کو بھارت سمیت دنیا کے ہر کونے میں موجود اقبال شناس سراہتے تھے۔

مجھے اندازہ نہیں کہ ان شخصیات کے رخصت ہونے کا مسلم سماج کو کتنا احساس ہے۔نظام فطرت کے تحت لوگ اسی طرح رخصت ہوتے رہیں گے۔گلستان علم میں اگر ہم نے نئے گل بوٹے نہ لگائے تو اس کی خوش بو کم ہوتی جائے گی۔جہاں علم کی خوش بو نہ ہو، وہاں جہالت کا تعفن پھیل جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ جانے والوں کی مغفرت کرے اور ہمیں ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

(بشکریہ: روزنامہ دنیا، لاہور، ۲۴/ نومبر ۲۰۲۲ء)

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

Trusted Name for Last 65 years

Best Treatment for Your Branded Kurtas, Bosky
Ladies' Shalwar Suits, Trousers, Dress Shirts & Jackets

Since 1949

Snowhite
DRYCLEANERS
Largest Cleaning Network ... COUNTRYWIDE!

TQCSI
Quality Certified
ISO 9001 : 2000

Brands of the year Award
IT'S ALL ABOUT CHAMPIONS
2011-2012

Web: www.snowhite.com.pk

Tel: 021-38682810